تاریخ آغاز:2008-05-27

صرف تھوڑا سا انتظار

از

راحت جبیں

ناول کا آغاز

دادی نے بڑے اہتمام کے ساتھ سنگترے کے چھلکے سکھا کر خوب ابریک پیسے اور ایک شیشی میں بھر دیئے۔ سیڑھیوں پر بیٹھی ہلکی ہلکی دھوپ کا مزہ لیتی ماہا نے ان کے اس جتن کو دیکھا اور ہنس دی۔

آپ کو کیا لگتا ہے دادی جان فئیر اینڈ لولی اشتہار کی طرح اسے منہ پر لیپ کرتے ہی آپ کی پوتیوں کے رشتے طے ہونے شروع ہو جائیں گے۔ اسے لگاتے ہی حمنہ آپی کی رنگت لشکارے مارنے لگے گی اور۔۔۔

ماہا۔ کینوؤں کی ٹوکری باہر لے کر آتی ثانیہ نے اسے سرزنش کی۔

بولنے دو اسے۔ اس کی زبان کے آگے تو خندق ہے۔ پٹر پٹر بولے گی۔ نہ بڑوں کا لحاظ نہ تمیز۔ نجانے کس پر پڑی ہے۔ دادی زیر لب اور بھی کچھ بڑبڑائیں۔

مجھے تو لگتا ہے دادی میں آپ پر پڑی ہوں۔

ٹوکری سے دو کینو اٹھاتے ہوئے ماہا نے بے حد سنجیدگی سے جواب دیا۔ جہاں ثانیہ نے مسکراہٹ دبائی وہیں دادی تڑپ اٹھیں۔

ہم تو ایسے بدلحاظ کبھی نہ تھے۔

چھوڑیں دادی جان آپ بتائیں اس کا کرنا کیا ہے۔ میں لگاؤں گی۔

سونیا نے ہمیشہ کی طرح دادی کا دل رکھا۔ سب سے چھوٹی تھی مگر سب کے دل میں جھانک لیتی

تھی۔ یا شاید اسے دل رکھنا آتا تھا۔ ثانیہ نے مسکرا کر اس کے ہاتھ سے شیشی لے لی۔

ابھی تو تمہاری اسکن خود اتنی سافٹ ہے کہ تمہیں ان چیزوں کی ضرورت ہی کیا ہے۔ وہ پیار سے اس کا گال چھو کر بولی۔ میں استعمال کروں گی۔ دادی کے ٹوٹکے ہنڈرڈ پرسنٹ رزلٹ دیتے ہیں۔

دادی ثانیہ کی اتنی سی بات پر خوش ہو گئیں چہکے سے بولیں۔

حمنہ سے بھی کہنا۔

جی۔۔۔ ثانیہ نے آہستگی سے کہا اور دادی کو دیکھا۔ بوڑھے چہرے پر جوان پوتیوں سے متعلق فکر ہی فکر تھی۔ کیا تھا اس گھر میں۔ سفید پوشی کا بھرم اور پانچ جوان لڑکیاں۔ ابھی تو صرف رباب کی شادی ہوئی تھی۔ دادی ہر آنے جانے والے کے سامنے یہی رونا روتیں۔ ثانیہ کو اچھا نہیں لگتا۔ حمنہ آپی تو بالکل ہی چپ ہو جاتیں۔ اپنی بے وقعتی کا احساس انہیں کڑھنے پر مجبور کر دیتا تھا۔ وہ دادی کو منع بھی کرتیں تو ان کی سمجھ میں یہ بات کہاں آتی۔ وہ چڑ جاتیں۔

کسی سے کہوں گی نہیں تو بات کیسے بڑھے گی۔ تمہاری ماں تو منہ میں کنکھیاں ڈالے بیٹھی ہے۔

اللہ کرے حمنہ کا کہیں رشتہ لگ جائے تو میں سکون کی نیند سوؤں۔ دادی اب بھی زیر لب بڑبڑا رہی تھیں۔

ان کے بعد بھی کہاں نیند نصیب ہو گی دادی آپ کو ان کے بعد بھی تین ہیں۔

ماہا نے ہنستے ہوئے کہا۔ دادی اس کا طنز پی گئیں۔ نجانے کیا سوچنے لگیں تھیں۔

اچھا اللہ بہتر کرے گا۔ پر جیسا رشتہ رباب کا جڑا شاید ہی کسی اور کا جڑے۔ دہلیز لے لی تھی احمر کی بہن نے۔ اللہ اسے خوش اور سکھی رکھے۔ انہوں نے سل ہی دل میں سوچا تھا۔

احمر اور رباب کی شادی ایک زبردست رومان کا نتیجہ تھی۔ اس میں بھی احمر کا ہاتھ زیادہ تھا۔ انہوں نے رباب کو ایک شادی میں دیکھا تھا۔ آکلر اپیا کو بتا دیا۔ صرف بتایا ہی نہیں پیچھا ہی لے لیا کہ ابھی جا کر پروپوزل دیں۔ ان کے والدین بہت پہلے وفات پو گئے تھے۔ بس وہ دونوں بہن بھائی ہی تھے۔ اپیا کی شادی ان کے بابا نے اپنی زندگی میں ہی کی تھی۔ مگر شادی کے چند سال بردہی اولاد نہ ہونے کی پاداش میں انہیں طلاق کا تحفہ مل گیا تھا۔ اپیا کالج میں اردو کی لیکچرار تھیں۔ انہوں نے اپنی زندگی اپنے چھوٹے بھائی کے لیئے وقف کر دی تھی۔ احمر نے انہیں رباب دکھائی تو وہ نازک سی خوبصورت لڑکی انہیں بھی بہت پسند آئی۔ وہ پروپوزل لے کر گئیں تو معلوم ہوا انہی دنوں ایک اور پروپوزل بھی زیر غور ہے۔ بلکہ فائنل ہونے کے قریب ہے۔ گھر والوں نے اپیا سے معزرت کر لی۔' اگلے دن وہ کودرباب کی امی سے ملے تھے ۔ رباب کو بھی معلوم ہو گیا تھا کہ ایک شخص انہیں اتنی چاہ سے مانگ رہا ہے۔ اس نے پردے کی اوٹ سے انہیں دیکھا بھی تھا۔ ان کی پرسنالٹی بات کرنے کو دلنشین انداز و لہجہ پھر اس کے لیئے اتنی چاہت اس کا ووٹ بھی احمر کی طرف ہو گیا، مگر وہ اپنی
پسند کا برملا اظہار نہ کر سکی اور معاملہ اپنے والدین کے سپرد کر دیا تھا۔ حقیقیتا اپیا اور احمر نے ان کے گھر کی دہلیز لے لی تھی۔ سو رباب کے والدین کو ہاں کرنی ہی پڑی۔ شادی کے بعد جب

رباب نے احمر کو بتایا تو وہ ہنسنے لگے۔

جناب آپ کو صرف ہماری کوششوں نے حاصل کیا ہے۔

جی نہی سب میری دعاؤں کا اعجاز ہے۔ وہ شرارت سے کہتی۔

احمر تو جیسے اسے پا کر سب بھول گئے تھے۔ انہوں نے تقریبا رباب کو سارا پاکستان گھمایا تھا۔ اسے اتنا کچھ خردی کر دیا تھا کہ ڈھیر لگ گئے تھے۔ آخر رباب نے ان کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔

میرے بس میں نہیں مگر میرا دل چاہتا ہے دنیا کی ہر چیز تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دوں۔

میرے پاس تو آپ ہیں احمر مجھے اور کچھ بھی نہیں چاہیئے۔ وہ نہال ہو کر کہتی۔

احمر اور اس کے درمیان میاں بیوی کے ساتھ ساتھ ایک خوشگوار دوستانہ تعلق پروان چڑھا تھا۔ احمر آفس سے واپسی پر اسے ہر بات بتاتے۔ گزرتے وقت کے ساتھ اگرچہ احمر کی محبت میں ٹھہراؤ سا آ گیا تھا مگر وہ اب بھی اس کا خیال رکھتے اور رباب نے تو انہیں اپنی زندگی کا محور بنا لیا تھا۔

بیٹے کی پیدائش کے بعد بھی وہ ان کا اولین دنوں کی طرح خیال رکھتی۔ اب جبکہ ایک دوسری روح اس کے وجود میں سانس لے رہی تھی تب بھی وہ ان کی خدمت میں کوئی کمی نہ رکھتی، اپیا نے اسے بالکل چھوٹی بہنوں کی طرح چاہا تھا۔

سارا گھر اس کے حوالے کر کے انہوں نے کبھی دخل نہیں دیا تھا۔ البتہ ہاتھ ضرور بٹاتی

تھیں۔اس حالت میں تو وہ اس کا بہت ہی خیال رکھتی تھیں۔لوگ ان کی اندگی پر رشک کرتے تھے۔ان کے گھر کو جنت کہتے تھے اور اب اپنی جنت کو احمر کو داپنے ہاتھوں برباد کرنا چاہ رہے تھے۔رباب کی محبت تو ایک طرف بچے بھی ان کت فیصلے کو زنجیر نہ کر سکے،ابھی کچھ دن پہلے تک تو سب ٹھیک تھا۔احمر اسے بتاتے تھے ان کے آفس میں ایک نئی لڑکی آئی ہے۔

یار عجیب احمق اور ہونق سی لڑکی ہے اسے تو لباس پہننے کا بھی سلیقہ نہیں۔

ایک دن کہنے لگے۔بیچاری غریب سی لڑکی ہے۔میں نے اس سے کہا ہے وہ ساتھ ساتھ اپنی تعلیم بھی جاری رکھے۔

یہ تو بڑی اچھی بات ہے۔عمر کی شرٹ بدلتے ہوئے اس نے لاپروائی سے کہا۔لیکن پلیز اب اسے ٹیوشن دینے مت بیٹھ جایئے گا۔

کیا مطلب؟احمر چونکے،

آج ہمیں امینہ کے ہاں جانا ہے اس لیئے عین وقت پر آ جایئے گا

پہلے کبھی لیٹ ہوئے ہیں جو آج ہوں گے۔ فس کے بعد میرا وقت تمہارے اور بیٹے کے لیئے ہی تو ہے۔

انہوں نے پیار سے اس کے ماتے پر بکھرے بال سمیٹے۔تو وہ ناز سے مسکرا دی۔دن یونہی محبتوں کی پھوار میں بھیگتے گزر رہے تھے کہ نجانے کب کہاں تبدیلی آئی کہ اسے محسوس تک نہ ہوا۔

اس دن موسم بہت اچھا تھا۔رباب کی طبیعت اگرچہ ٹھیک نہ تھی۔پھر بھی اس نے لنچ پر تھوڑا سا

اہتمام کرلیا۔احمر کو قیمہ کریلے بہت پسند تھے۔اس نے وہ بھی بنا لیئے۔مگر وہ لنچ پر انتظار ہی کرتی رہی اور چار سالوں میں یہ پہلا موقع تھا کہ احمر لنچ پر نہیں آئے تھے۔

کوئی کام ہوگا۔تم لنچ کرلو۔اپیا نے کہا۔

میں ایک بار معلوم کرلوں۔۔۔آفس فون کیا تو معلوم ہوا وہ لنچ کے لیئے جا چکے ہیں۔وہ بے یقینی سے اپیا کو دیکھنے لگی۔

کسی دوست کے ساتھ نکل گیا ہوگا۔اپیا نے تسلی دی۔

مگر ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا۔رباب الجھنے لگی۔

اپیا نے ایک نظر اس کی پریشان صورت کو دیکھا پھر ہنس دیں۔جانتی تھیں کہ وہ احمر سے کتنی محبت کرتی ہے۔وہ آئے گا تو پوچھ لینا اتنا پریشنا کیوں ہو رہی ہو۔چلو تم کھانا کھاؤ۔اس حالت میں زیادہ دیر بھوکے رہنا ٹھیک نہیں۔

اپیا نے سمجھایا۔اس نے پھر بھی انتظار کیا۔شاید کہیں رساتے میں رک گئے ہوں مگر انہیں نہیں آنا تھا نہیں آئے۔موسم کی ساری خوبصورتی غارت ہوگئی۔وہ یونہی بے دلی سے چند لقمے لے کر اٹھ گئی۔شام کو احمر آئے تو اسکا موڈ دیکھ کر پشیمان ہوگئے۔

سوری جانم سوری۔درواصل ایک بہت پرانا دوست مل گیا تھا۔کھینچ کر لے گیا۔میں نے لاکھ کہا کہ بھئی ہماری پیاری بیوی۔

بس۔۔۔بس۔۔۔میں نے آپ سے کچھ پوچھا ہے؟

وہ کتنی آسانی سے ان پر ایمان لے آئی تھی۔ احمر اس کے سامنے شرمندہ ہوں اسے بالکل بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ تھی ہی پاگل۔ احمر کو روز کوئی نہ کوئی دوست ملتا رہا رفتہ رفتہ لنچ باہر کرنا ان کا معمول بن گیا۔

رباب اکیلے لنچ کرتی۔ مگر ایک خالی پن کا احساس سا ہوتا۔

احمر واپس آ کر کئی بار معزرت کرتے۔ وہ ہنس دیتی۔ رفتہ رفتہ یہ معزرت بھی گئی۔

آج کل اسے گھر بہت یاد آنے لگا تھا۔ امی، ابو، بہنیں اکلوتا بھائی۔ دادی کی باتیں۔ امرود کے درخت ہر شور مچاتی چڑیاں، رات کو ٹی وی کے سامنے جمنے والی محفلیں۔ حتیٰ کہ بیڈروم میں بکھرے مونگ پھلیوں اور کینو کے چھلکے بھی۔ جنہیں سمیٹتے ہوئے وہ سب کو بے بھاؤ کی سناتی تھی۔ سناتے سناتے اس کے منہ سے کوئی لفظ الٹا نکل جاتا۔ وہ تینوں ہنستے ہنستے دادی کے لحاف میں چھپنے لگتیں۔ خود اس کا غصہ نجانے کہاں غائب ہو جاتا۔ امی اور دادی اس طرح ہنسنے پر ہمیشہ ڈانٹنے لگتی تھیں۔ مگر قہقہے چھت پھاڑنے لگتے۔ ہاں ماہا کی طبیعت تھوڑی نازک تھی اسے جلدی غصہ آ جاتا تھا،

سونیا نے بہت دنوں سے خط نہیں لکھا۔

فون کے باوجود سونیا کو خط لکھنے کا خبط تھا۔ اپنی معصوم معصوم باتوں سے سارا خط بھر دیتی۔ رباب بہت دنوں تک اس خط کو پڑھ کر لطف اٹھاتی۔

آپی پانی کی ٹنکی کے پاس جو سوراخ ہے اس میں گلہری نے بچے دیے ہیں۔

سفید کبوتری غائب ہے۔ غالب گمان ہے کہ کسی بلے کے ہاتھ لگ گئی ہے۔ دادی نے اس کے غم می کئی دن ڈھنگ سے کھانا نہیں کھایا۔

آج ماہا کی امی کے ساتھ لڑائی ہو گئی۔

سرور کے باغ کے مالٹے تیار ہو گئے ہیں۔ کل ہی بوری بھر کر دے کر گیا ہے۔ دادی کو یقین ہے کہ اب ان کی پوتیوں کے رنگ ضرور ہی نکھر جائیں گے۔ اور یہ سب پڑھ کر رباب کو لگتا وہ وہیں ان کے پاس ہے۔

یار یہ تم اتنی ڈل سی کیوں رہنے لگی ہو؟ اسے خبر نہیں تھی۔ احمر نجانے کب سے ناقدانہ نظروں سے اسکا جائزہ لے رہے تھے۔

وہ چونکی چائے ابل گئی تھی۔ کیوں کیا ہو گیا؟

کپ نکالتے ہوئے وہ زرا سا مسکرائی۔ آج کل اس کی کمر میں مستقل درد رہنے لگا تھا۔ جسم بھی بے ڈول ہو گیا تھا۔ پھر بھی عام عورتوں کی طرح وہ خود سے غافل کبھی نہ رہی تھی۔

بہت سست نظر آنے لگی ہو اور جسم دیکھو کیسے پھیل رہا ہے۔

رباب ہنس دی۔ کپ اس کے سامنے رکھا۔ یہ سب تو فطری ہے زرا فارغ تو ہونے دیں پھر دیکھیں میں ویسی کی ویسی ہی نظر آؤں گی۔ ویسے،۔۔۔ اس نے شرارتی نظروں سے احمر کو دیکھا۔

سنا ہے مرد کو شادی کے چند سال بعد اپنی بیوی پرانی گاڑی کی طرح لگنے لگتی ہے۔ کہیں آپ

کے ساتھ بھی تو ایسا ہی نہیں ہو رہا۔

احمر جھینپ گئے۔ایسی کوئی بات نہیں۔

ذرا غور تو کریں۔آپ کے تیور کچھ بدلے بدلے سے نظر آتے ہیں۔وہ مائل بہ شوخی تھی۔

اچھا وہ کیسے؟احمر چونکے۔

اپنے لباس کا بہت دھیان رکھنے لگے ہیں اب تو مجھ سے بھی مشورہ نہیں لیتے۔کل براؤن سوٹ کے ساتھ کیسی بدرنگ ٹائی لگا کر گئے تھے۔بہت فضول لگ رہی تھی۔

اچھا۔۔احمر ایک پلکو نجانے کہاں کھو گئے۔حالانکہ لوگ لیتے ہیں اس سوٹ کے ساتھ وہی تائی میچ کرتی ہے۔

انتہائی بدذوق لوگ ہیں۔رباب برجستہ بولی۔بائی دا وے یہ لوگ ہیں کون؟

یہی آفس کولیگ وغیرہ۔نجانے کیوں وہ نظریں چرا گئے۔

صرف یہی نہیں۔وقت بے وقت گھر سے غائب ہو جانا۔لنچ گھر سے باہر کرنا۔پرفیوم کا بیتحاشا استعمال اور تو اور اکثر ٹیرس پر کھڑے گنگناتے اور آس پروس میں جھانکتے بھی پائے گئے ہیں۔

اس نے ہلکے پھلکے لہجے میں ان کے اندر ہونے والی تبدیلیاں گنوائیں پھر دوستانہ انداز میں بولی۔سچ سچ بتائیں کہیں کوئی چکر تو نہیں چلا بیٹھے۔

اگر واقعی ایسا ہو تو؟چائے کی پیالی میں جھانکتے ہوئے احمر نے بھرپور سنجیدگی سے کہا۔

رباب کئی لمحے ششدر سی حیرت آمیز بے یقینی سے انہیں دیکھنے لگی۔تب ہی احمر کا بھرپور قہقہہ فضاء میں گونجا بس ڈر گئیں۔

رباب کے سینے میں اٹکی ہوئی سانس باہر آئی۔پھر آہستہ آہستہ نفی میں سر ہلاتی ہوئی بولی نہیں۔ایسی کوئی بات نہیں۔

اتنا یقین ہے مجھ پر؟

مجھے معلوم ہے آپ مجھے چیٹ نہیں کر سکتے۔

اس کے لہجے سے چھلکتا بر پور اعتماد اور یہاں متا دان محبتوں کا اعجاز ہی تو تھا۔

فرض کرو اگر ایسا ہو جائے تو؟وہ نجانے کیا کہنا چاہتے تھے۔کیا بتانا اور کیا پوچھنا چاہتے تھے۔

رباب نے ان کے لہجے پر غور ہی نہیں کیا۔تب ہی عمر بھاگتا ہوا آیا رباب نے دونوں بازو پھیلا کر اسے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیا۔پھر عمر کے کندھے پر تھوڑی ٹکا کر چمکتی آنکھوں سے انہیں دیکھتے ہوئے بولی۔

جناب ایسا کبھی نہیں ہوسکتا۔بھلا ایک پرسکون گھر،پیارے پیارے سے بیٹے اور خوبصورت بیوی کے ہوتے ہوئے بھی کوئی بھٹک سکتا ہے۔وہ مسکراتی ہوئی بچوں کو لے کر چلی گئی۔

تو پھر ایسا کیوں ہوا؟احمر زیرلب بڑبڑائے تھے۔

کب سے وہ برآمدے کی ٹھنڈی ٹھار سیڑھیوں پر بیٹھی ڈبل روٹی کو چورا کر کے چڑیوں کو ڈال رہی تھی۔امرودوں کی شاخوں پر چھپی چڑیاں شور مچاتی نیچے آتیں تو اس کی سیاہ آنکھیں چمک اٹھتیں اور وہ زور و شور سے گننے لگی۔

ایک۔۔۔دو۔۔۔تین۔۔۔پندرہ۔۔۔پچیس۔۔

جیسے ہی ڈبل روٹ ختم ہوتی تو ساری چڑیاں پھر سے اڑ جاتیں۔جب امی کمرے سے نکل کر کچن کی طرف جاتیں تو ٹھٹھک کر رکتیں اور بغیر سویٹر کے یوں وہاں بیٹھنے پر سخت سست سناتیں ۔مجھے ٹھنڈ نہیں لگی۔

وہ روز جھنجھلا کر وہاں سے اٹھتی اور دادی کے لحاف میں جا گھستی۔جو پلنگ پر بیٹھے لحاف ارد گرد لپیٹے تسبیح کرتی تھیں۔

ہائے ہائے کیا مردے جیسے ہاتھ ہیں۔میں کہتی ہوں پیچھے ہٹ جا۔

وہ کچھ اور لپٹ جاتی۔اونٹ کی اونٹ ہوگئی پر عقل۔۔

دھیرے دھیرے دادی کی مزاحمتیں دم توڑ دیتیں۔ان کی ڈلواتیں سونیا کی کھلکھلاہٹوں میں گم ہوجاتیں اور حقیقت تھی کہ وہ اپنی اس چھوٹی پوتی کو چاہتی بھی بہت تھیں۔پھر وہ وہاں سے اس وقت نکلتے جب ثانیہ یا امی ناشتے کے لیئے پکارتیں۔ماہانے تو جب سے کالج چھوڑا تھا صبح اٹھنا گویا اس کے لیئے حرام تھا،

تیز ہوتی بیل کی آواز پر اس نے ساری ڈبل روٹی ایک ساتھ چڑیوں کو ڈال دی۔اس کا خیال تھا شاید دودھ والا کچھ جلدی آ گیا ہے۔امی ابھی تک شاید اٹھی نہ تھیں یا شاید نماز میں مصروف تھیں۔وہ کچن سے برتن لے کر دروازے تک چلی آئی۔کون ہے۔۔۔؟

باجی میں ہوں مانی۔

مانی۔۔۔اس نے زیر لب دہرایا پھر خالہ ہاجراں کا بیٹا مانی یاد آ گیا۔وہ بچپن میں تو اس کا کلاس فیلو تھا لیکن بڑے ہونے کے بعد اس نے اسے نہیں دیکھا تھا۔

سونیا نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔لمبا تڑنگا مانی برا ہو کر خاصا بدل گیا تھا۔مگر وہ رو کیوں رہا تھا۔

باجی۔۔۔اس کے آنسو کچھ اور روانی سے بہنے لگے تھے۔

کیا ہوا مانی۔۔۔؟

باجی امی فوت ہو گئیں۔اس نے بمشکل بتایا۔

کیا۔کب؟ سونیا چیخا ٹھی۔مانی کے ابو کا بہت بچپن میں انتقال ہو گیا تھا۔پانچ بہنیں اور دو بھائی تھے۔

رات کو۔۔۔انکل کو بھیجیں۔۔۔گھر میں کوئی نہیں ہے۔

وہ سرپٹ اندر بھاگی تھی۔دادی۔۔۔دادی۔

اس کی چیخ و پکار پر سب بوکھلا گئے تھے۔دادی۔۔۔وہ ان کی گود میں سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

کیا ہو گیا سونیا میری بچی۔کچھ بتا تو۔۔۔

خالی ہاجراں۔خالہ ہاجراں فوت ہو گئی ہیں۔

ہائے نہیں۔امی نے دہل کر دل پر ہاتھ رکھا۔

تمہیں کس نے بتایا ہے۔ثانیہ آپی نے آگے بڑھ کر اسے سیدھا کیا۔حمنہ آپی ششدر سی کھڑی تھیں

مانی آیا تھا ابھی۔

اللہ رحم کرے۔اس کے تو چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ایک ہی بیٹی بیاہی ہے ابھی۔یہ مانی ہی تو بڑھا ہے اب گھر میں۔۔۔ایسی قیامت۔

کیا ہو گیا۔ابو ابھی ابھی مسجد سے لوٹے تھے۔حیران پریشان انہیں یوں روتا ہوا دیکھنے لگی۔امی نے انہیں بتایا۔

ابھی تو میں مسجد سے آیا ہوں۔انہوں نے حیران ہو کر سب کو دیکھا۔ایسی کوئی بات ہوتی تو محلے میں خبر ہو جاتی تھی۔کیوں سونیا۔کوئی غلط فہمی تو۔۔۔

ابو مانی خود آیا تھا ابھی پانچ منٹ پہلے۔سونیا نے زور دے کر کہا۔

ارے بچہ گھبرا کر سیدھا ادھر ہی بھاگا ہو گا۔دادی نے لحاف ایک طرف کرتے ہوء کہا اور خود جلدی جدلی چپل پہننے لگیں۔

ثانیہ چادر دو میری۔میں اور عائشہ جاتے ہیں۔ایسے کڑے وقت می بچیاں بیچاری کیا کرتی ہوں گی کوئی رشتے دار بھی پاس نہیں ہے۔

ہاں آپ لوگ چلیں۔میں محلے سے ایک دو لوگوں کو لے کر آتا ہوں۔ابو نے کہا۔گھر کے عقب میں وسیع کالی گراؤنڈ تھا۔جس کو عبور کر کے خالہ ہاجراں کا گھر تھا۔گلی بالکل سنسان تھی۔

اور براؤن دروازے والے گھر پر بلا کا سناٹا تھا۔

امی اور دادی نے ایک دوسرے کو دیکھا۔تذبذب کے عالم میں چانیہ نے جو ساتھ ہی آ گئی تھی نے بیل پر انگلی رکھی۔کاموش گھر میں دور بیل گونجی۔پھر کوئی مرغا بولا۔اندر کہیں دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز آئی۔چوتھی بیل پر کوئی چپل گھسیٹتا دروازے تک آیا۔

اے ہے۔۔چھری تلے دم تو لو۔ایسی کیا آفت اا گئی۔عجیب ہی دستور ہے۔نہ کوئی وقت دیکھتے ہیں بس ملکالموت کی طرح دروزے پر آ کھڑے ہوتے ہیں۔۔۔دو گھڑی کی نیند لینا بھی عزاب۔۔میں کہتی ہوں۔

جہاپڑ پڑ بولتی زبنا کو بریک لگی تھی وہیں ان تینوں کو سانپ سونگھ گیا تھا۔

ثانیہ مجھے پکڑنا۔۔۔اس سے پہلے کہ دادی چاروں شانے چت گلی میں پڑی ہوتیں چانیہ نے انہیں سنبھال لیا۔

اپنے بھاری تن وتوش کے ساتھ نیلی گرم چادر اوڑھے خالہ ہاجراں ان کے عین سامنے کھڑی تھیں۔

ارے۔۔آپا۔۔خالہ۔۔۔ثانیہ خ خ۔۔خیریت َصبح صبح۔خالہ ہاجراں ہکا بکا کھڑی تھیں۔

اور وہ تینوں کو دان سے زیادہ ہونق صورتوں کے ساتھ انہیں دیکھ رہی تھیں۔

تم۔۔۔تم ٹھیک تو ہو۔دادی نے بہت ڈرتے ڈرتے انہیں چھونے کی کوشش کی۔

لو مجھے کیا ہونا ہے۔۔۔آپ کے سامنے ہوں پر آپ لوگ۔۔۔

واک۔۔ مارننگ واک کے لیئے نکلے تھے خالہ۔۔تو امی نے کہا آپ کی خیریت۔ کہتے کہتے ثانیہ بےبس سی ہوکر امی کو دیکھنے لگی۔

دسمبر کی اس دھند میں بیٹی دماغ ٹھیک تو ہے۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ دادی کو ہی گھر چھوڑ آتیں۔اس کی بوڑھی ہڈیوں کو کاہے کو ہوا لگواتی پھر رہی ہو۔

نہیں۔نہیں مجھے تو خود بہت شوق ہے اس مار۔۔۔ مار۔دادی نے بعجلت کہنا چاہا۔

مارننگ واک۔ثانیہ نے مدد کی۔

ہاں اس کا۔۔اپنے پنڈ میں تو نور تڑکے۔۔۔ساگ توڑنے نک جاتے تھے۔دادی نے کہا تو خالہ اجراں ہنسنے لگیں۔

اچھا تو آپ ساگ توڑنے نکلی ہیں۔اچھا اندر تو آئیں۔وہ تینوں اندر داخل ہوئیں کالہ ہاجراں نے ایک ایک کمرے کا دروازہ پیٹنا شروع کر دیا۔

اٹھو کمبختو۔۔مہمان آئے ہیں۔کسی پوستی کی اولاد لگتے ہیں سارے کے سارے۔

مانی کہاں ہیں؟امی نے بدقت پوچھا۔وہ اس وقت کو کوس رہی تھیں جب سونیا کی بات کا یقین کر کے گھر سے چلی تھیں۔

خالہ ہاجراں نے ایک کمرے سے مانی کو کان سے پکڑ کر برآمد کیا۔

اس کی صبح تو بارہ بجے سے پہلے ہوتی ہی نہیں۔۔سلام کر۔۔اور جلدی سے دوڑ بے بسکٹوں کے پکڑ کر لا۔

اونگھتے جاگتے مانی نے سلام کیا اور اتنی صبح صبح وارد ہونے والے مہمانوں کو دل می کوستا دکان کی سمت چل دیا۔ان کے لاکھ منع کرنے کے باوجود خالہ ہاجراں نے انہیں بٹھایا۔ان کی بیٹیوں نے چائے چڑھا دی۔چائے کے کپ ہاتھ میں تھے۔جب تیز بیل کی آوز پر مانی نے دروازہ کھولا۔

ابو۔حاجی صاحب ، رحمت چاچا دو چار محلے کے اور لوگ۔۔۔دروازے میں کھڑے اپنی سامنے کھڑی ہاجراں کو دیکھ کر متحیر رہ گئے۔سمجھ میں نہیں آ رہا تھا آگے جائیں یا پیچھے۔میرا کیا حشر ہوا اس کو جانے دیں۔بس ابو نے چائے کے ساتھ بسکٹ کھاتے ہوئے خالہ ہاجراں کو سارا قصہ سنایا۔وہ ہنستی رہیں اور اپنے گھر التعزیت کے لی ے آنے والوں کو چائے بسکٹ پیش کرتی رہیں اور پوچھتی رہیں۔

میرے جنازے می شرکت کے لیئے آئے ہو؟اصل تماشا اس وقت بنا جب شام کو ان کی بیاہی بیٹی اپنے سسران والوں کے ساتھ روتی پیٹتی گھر پہنچی تو ماں کو زندی دیکھ کر مارے حیرت اور خوشی کے بیہوش ہو کر گر گئیں۔اب آپ سوچ رہی ہوں گی وہ مانی کون تھا۔

آپ کو چچا رحمت یاد ہوں گے بچپن میں کبھی ہمارے گھر آیا کرتے تھے۔حالنکہ ہمارے رشتے دار نہ تھے۔مگر ابو نے ان کی وفات کے بعد ان کے بیوی بچوں کی ہمشیہ مدد کی تھی۔ان کی بیوی فوت ہوئی تھیں۔ابو ان کے قلوں پر پہنچ نہ سکے اب کو د بتائیں اس پورے قصے میں کہیں میرا قصور نکلتا ہے۔

ماما سارا دن کتابیں پڑھتی رہتی ہے۔ثانیہ آپی نت نئی ڈشز بنانے میں مصروف رہتی ہیں۔دادی پوچھ رہی ہیں آپ کو کب آنا ہے؟ دسمبر کا وعدہ کیا تھا اب تو پورا دسمبر گزر گیا۔سب آپکو بہت یاد کرتے ہیں۔

آپ کی بہن۔

سونیا۔

سونیا اب بھی اتنی ہی معصوم ہے۔رباب اس کا خط پڑھ کر بہر دیر تک ہنستی رہی تھی۔

خیریت۔فائل سے سر اٹھا کر احمر نے اسے یوں ہنستے دیکھا تو پوچھنے لگے۔

سونیا کا خط ہے۔اس نے خط ان کی طرف بڑھا دیا۔جسے یکسر نظر انداز کر کے انہوں نے چائے کی فرمائش کی تھی۔رباب نے کچھ جھجل سا ہو کر خط یونہی ٹیبل پر ڈال دیا۔

آپ سے کتنے دنوں سے کہہ رہی ہوں خط کے لفافے ختم ہو گئے ہیں۔وہ اٹھتے ہوئے قدرے خفگی سے گویا ہوئی۔

لے تو آیا تھا بریف کیس میں پڑے ہوں گے۔ویسے فون کے اس دور میں خط لکھنے کا کھڑاک کیوں پالتی ہو تم لوگ۔۔۔؟

خیر ہے آج کل ہماری ہر بات پر ہی اعتراض ہونے لگا ہے۔وہ بریف کیس کی طرف جاتے جاتے بولی تھی۔

بات کا بتنگڑ بنانا تو کوئی تم عورتوں سے سیکھے۔باتھروم کا دروازہ ایک آواز سے بند ہوا۔

کیا ہوتا جا رہا ہے انکو۔۔۔بریف کیس کھولتے ہوئے وہ یہی سوچ رہی تھی۔لفافے نکالتے نکالتے اس کی توجہ ایک سرخ مخملیں ڈبیہ نے کھینچ لی،کچھ حیرت اور تجسس سے مجبور ہو کر اس نے ڈبیا کھولی۔خوبصورت سونے کا بریسلٹ جگر جگر کر رہا تھا۔

میرے لیئے۔دل میں ایک دم خیال سا آیا۔بے اختیار ہی اس نے بریسلٹ کو چھو کر دیکھا پھر کو چھ سوچ کر بریف کیس بند کر دیا۔اگر بریسلٹ اس کا تھا تو ظاہر ہے اسے ہی ملنا تھا۔نجانے احمر نے کس خاص نوقع کے لیئے سنبھال رکھا تھا۔چائے بناتے ہوء بھی اس کے دل میں کھد بد ہوتی رہی۔مگر اس نے احمر سے پوچھا نہیں تھا۔

چھوٹی پھوپھو نے لیہ سے کچھ مونگ پھلی۔کی بوری شکر قندی اور مکئی کا آٹا بھجوایا ہے۔یہ ان کی پانی زمینوں کی سوغات تھی جو وہ ہر بار بھجواتی تھیں۔لیکن اس بار لانے والا علی شیر تھا۔پھوپھو کا اکلوتا بیٹا۔ساتھ میں ابا کے نام خط بھی تھا جس میں ان سے درخواست کی گئی تھی کہ علی شیر نے ایف اے کر لیا ہے اب برائے مہربانی اپنی نگرانی میں بی اے کروا دیں۔نہایت دلسوز اور دلگیر لہجے میں لکھا تھا۔

بھیا اپنا دکھڑا تم سے نہ کہوں تو کس سے کہوں۔اس کے باپ کو تو زرا پراوہ نہیں۔اس کا بس چلے تو کل کے بجائے آج ہی اپنے ساتھ کھیتوں میں کھپا لے۔یہ نہ کھیتوں پر جاتا ہے نہ آگے پڑھنے کو تیار ہوتا ہے۔سارا دن گلیوں میں آوارہ پھرتا ہے۔بس اب تمہارے حوالے ہے۔جیسے بھی ہوا سے بی اے کروا کے کہیں نوکر لگوا دو۔کھیت سنبھالنے کو دوسرے دونوں لڑکے کافی

ہیں۔ یوں بھی کھیت ہیں ہی کتنے بس دال روٹی چلتی ہے۔ یہ کہیں نوکر ہو جائے تو اس کی زندگی سنور جائے گی۔ تمہارے آسرے پر بھجوا رہی ہوں۔ سسرال میں میری ناک مت کٹوا دینا۔ بھلے کتنی ہی سختی کرو۔ اماں اور بھابھی کو سلام۔ بچیوں کو پیار۔

تمہاری چھوٹی بہن

آسیہ۔

کیوں میاں پڑھنے کا کچھ ارادہ بھی ہے یا۔۔۔؟

پھوپھو کی ٹوٹی پھوٹی لکھائی میں لکھا خط پڑھ کر طے کرتے ہوئے ابو نے علی شیر سے پوچھا تھا۔ سفید شلوار قمیض پر سرمئی سویٹر پہنے دادی کے پاس بیٹھے علی شیر نے سر اٹھا کر سنجیدہ نظروں سے ماموں کی طرف دیکھا۔

میں تو پڑھنا چاہتا تھا مگر ابا۔۔۔

ٹھیک ہے۔۔ ٹھیک ہے۔ ابو نے سر ہلایا۔ داخلے میں ابھی ایک دو مہینے ہیں تب تک تم کوئی کمپیوٹر یا انگریزی کے کورس میں داخلہ لے لو۔ عائشہ اسے بیٹھک کے ساتھ والا کمرہ دے دو۔

ابو حکم سنا کر چلے گئے۔ ثانیہ اور حمنہ آپی کمرہ صاف کرنے چلی گئیں۔ دادی ملے تو نواسے پر واری صدقے جاتی رہیں پھر کڑاہی میں ریت ڈلوا کر خود مونگ پھلی بھوننے بیٹھ گئیں۔ امی وہیں بیٹھی بڑبڑاتی رہیں۔ علی شہر نانی اور ثانیہ کے پاس بیٹھ کر انہیں مونگ پھلی بھوننے کا صحیح طریقہ سمجھا رہا تھا۔

کیسا تیز لڑکا ہے۔۔۔

علی شیر کو گھور کر وہ اٹھ گئیں اور رات ابو پر برس پڑیں۔

سرائے سمجھ لیا ہے کیا تمہارے رشتہ داروں نے اس گھر کو۔ جس کو دیکھو منہ اٹھائے چلا آ رہا ہے۔ چار سال تمہارے بھائی کے لڑکے کو پڑھوایا۔۔ وہ پروفیسر لگ کر یوں غائب ہوا کہ اب شکل دکھانا بھی گوارا نہیں۔ چار سال تمہاری بڑی بہن کو یاد آیا تو اپنے لڑکے کو بھیج دیا کہ امتحان دلوا دو۔ اسے ڈھنگ کی نوکری ملی تو کہاں کا ماموں اور کہاں کی مامی۔ باقی تو کسی قطار میں شمار نہیں۔ جس کا جب دل چاہتا ہے مہینوں آ کر ڈیرا ڈال لیتا ہے۔

بستر کی چادریں جھٹک جھٹک کر بچھاتے ہوئے وہ دل کا غبار نکالتی رہیں۔

تو اسے واپس بھجوا دوں۔ ابو ہمیشہ ٹو دی پوائنٹ بات کرتے تھے۔

امی تڑخ کر بولی تو پھر بولتی چلی گئیں۔ ابو کان لپیٹ کر سنتے رہے۔ یہاں تک کہ خبریں شروع ہو گئیں تو وہ پورے کے پورے خبروں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ وہ امی کی کسی بات کا برا نہیں مانتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ زبان سے خواہ کچھ بھی کہیں۔ علی شیر کی دیکھ بھال میں کوئی کمی نہ کریں گی۔ اور غلط تو امی بھی نہ تھیں۔ ابو کے تمام رشتے دار گاؤں میں رہتے تھے۔ شہر کے کسی کام سے آنا ہوتا تو مہینوں ان ہی کے ہاں رکنا ہوتا۔ امی نے ساری عمر بغیر ماتھے میں شکنیں لائے ان کی خاطر داری کی تھی۔ لیکن جب جوابا اسی خلوص کا مظاہرہ تو وہ اب اندر ہی اندر کڑھنے اور چڑھنے لگی تھیں۔ تایا نے اپنے بیٹے کو چار سال تک ان کے پاس چھوڑے رکھا۔

اسے پڑھا دو کل کو تمہارے ہی کام آئے گا۔

انہوں نے واضح طور پر حمنہ آپی کے رشتے کی بات کی تھی اور چار سال جب عظیم بھائی لیکچرار ہو گئے تو بڑے ڈھٹائی سے تایا ابا نے انہیں کا ندان سے باہر بیاہ دیا۔ اپیا مہینوں بیمار رہیں۔ اس نا انصافی پر دادی نے واویلا کرنا چاہا تو ابو نے سختی سے منع کر دیا۔ وہ اپنی بیٹی کی مزید نا قدری نہیں کروا سکتے تھے۔ یہی کچھ انکی بہن نے بھی کیا تھا۔

وہی امیدیں وہی آرزوئیں۔ وہی آنکھوں میں چمک۔ جو چار جوان بیٹیوں کے ماں باپ کی نظروں میں جا گتی تھی اور وہی نا قدری۔ بیٹا نہیں مانتا۔ اپنی بہو کا لاکھوں کا جہیز سنبھالتے ہوئے بڑی پھوپھو نے کہا۔ ابو ایک بار پھر صبر کر گئے۔

رشتے داروں کا بھی حق ہوتا ہے۔ امی ابو کے اس جملے سے اب چڑنے لگی تھیں۔ صرف حق ہی حق ہوتا ہے فرائض کسی کو یاد نہیں۔

ننھیال میں تو سب ابھی پڑھ رہے تھے چھوٹے تھے۔ مگر ددھیال نے ان لڑکیوں کے ساتھ اچھا سلوک نہ کیا۔ پڑھی لکھی۔ قبول صورت۔ سلیقہ شعار لڑکیاں مگر قسمت کھلنے میں نہ آ رہی تھی۔ اوپر سے خاندان والوں کا رویہ۔ وہ اگر چڑنے لگی تھیں تو کچھ غلط بھی نہ تھا۔

اللہ مالک ہے۔۔۔ خبریں سنتے سنتے ابو کے منہ سے آہستہ سے نکلا۔ کسٹرڈ میں چن چن کر ساری کشمش اکٹھی کرتے سونیا نے یہ ساری گفتگو سنی تھی۔

جلدی جلدی۔ کہہ کر احمر نے اس کے ہاتھ پر پھلا دیئے تھے،

تم رات کو پریس نہیں کرسکتی تھیں؟

وہ پھر سر پر کھڑے تھے۔ ماہا نے جلدی سے شرٹ پریس کر کے انہیں تمائی اور کچن میں بھاگی۔ اپیا نے پہلے ہی ناشتہ بنالیا تھا وہ جلدی جلدی میز پر رکھنے لگی۔ اپیا نے منع بھی کیا کہ وہ آرام بھی کر لے۔

کیا خاک آرام کروں صاحب بہادر کا موڈ دیکھا ہے۔ وہ جھنجھلا کر چائے نکالنے لگی۔ اتنے میں احمر نے بریف کیس اٹھالیا۔

اب ناشتہ تو کر لیں۔

اب وقت ہے؟ انہوں نے بری طرح گھورا۔

نہایت سست ہوتی جا رہی ہو رات کو سب تیار نہیں کرسکتی تھیں۔

کیا ہو گیا ہے احمر تم اچھی طرح جانتے ہو اس کی طبیعت خراب تھی۔ اپیا نے لتاڑا وہ سر جھٹک کر چلے گئے۔ اپیا نے دیکھا وہ بیدم سی ہو کر کرسی پر گر سی گئی تھی۔

اب تم ناشتہ کر واس کے لیئے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں کھالے گا آفس میں کچھ نہ کچھ۔۔۔

یہ مرد اتنے کٹھور کیوں ہوتے ہیں اپیا؟ وہ دلگرفتگی سے گویا ہوئی۔ ایک دن اگر ذرا سی بھول ہو جائے تو سب کچھ ہی بھلا دیتے ہیں۔

یہ ایسے ہی ہوتے ہیں اس لیئے ان کی طرف سے زیادہ پریشان مت ہوا کرو۔ تمہیں پہلے ہی

سمجھاتی تھی مت کرو اس کی اتنی خدمتیں۔ کچھ زیادہ ہی نازک مزاج ہو گیا ہے۔ تم یہ ٹوسٹ لو۔ جوس بنا دوں۔۔۔؟

نہیں جی نہیں چاہ رہا۔ وہ بے دلی سے مکھن لگا کر ٹوسٹ کھانے لگی۔ آپ کو نہیں لگتا اپیا احمر بدل سے گئے ہیں؟

بدل کر اس نے کہا جانا ہے۔ میں تو اسے گنجا کر دوں گی۔ سب تمہارا وہم ہے۔ انہوں نے جلدی جلدی ناشتہ ختم کیا۔ اب تم کچھ مت کرنا بس سو جانا۔ شام کو کہیں نکلیں گے۔

اپیا چلی گئیں تو عمر اٹھ گیا۔ وہ اس کے ساتھ مصروف رہی۔ شام کو احمر آئے تو موڈ کو شگوار تھا۔ پھر اپیا نے خوب لتاڑا اور شاید ان کو خود بھی احساس ہوا عمر کو ساتھ لے کر گئے۔ اسے آئس کریم کھلائی۔ رباب کے لیئے پزا لے کر آئے۔ عمر کو گدگداتے اور گنگناتے رہے۔

آپ کبھی کبھی اتنے اجنبی کیوں ہو جاتے ہیں؟ ان کے بازو پر سر رکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔

کب۔۔۔؟

اکثر۔۔۔ اب تو اکثر ہی۔۔۔

وہم ہے جاناں۔ وہ اس کے بالوں میں چہرہ چھپا کر بولے۔ وہ انہیں جٹلانا چاہتی تھی۔ وہم نہیں تھا وہ محسوس کو رہی تھی۔ کچھ تبدیلیاں ان سے شئیر کرنا چاہتی تھی۔ اپنے خدشات۔ مگر ابھی الفاظ ترتیب دے رہی تھی کہ احمر سو گئے۔ وہ زرا سا ہلی تو انہوں نے کروٹ بدل لی، اور ایسا کب ہوا تھا۔ وہ بات کرنا چاہ رہی ہو اور احمر سو جائیں۔

وہ ٹکٹکی بنا دھ کر ان کا چہرہ دیکھنے لگی پھر آہستہ آہستہ سر جھٹکتے ہوئے بڑبڑائی۔ وہم نہیں ہے میرا۔۔۔

اس کے متلاشی نگاہیں گھوم کر بریف کیس پر رک گئیں آہستگی سے اٹھ کر وہ ٹیبل تک آئی۔ ہلکے سے کھٹکے کے ساتھ بریف کیس کھل گیا، رباب کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ مخملیں کیس اب وہاں نہیں تھا۔ اس نے بیتابی کے ساتھ بریف کیس کھنگالا۔

سو جاؤ رباب کیا کر رہی ہو۔۔۔ احمر کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز ابھری تھی۔ رباب نے مرے مرے ہاتھوں سے بریف کیس بند کر دیا علی شیر کا کالج میں ایڈمشن ہو گیا تھا۔ دو تین ماہ میں وہ گھر کا اہم فرد بن گیا تھا۔ ہارون کی جاب پنڈی میں تھی۔ وہ تو چھٹیوں میں کبھی کبھار ہی آتے۔ علی نے گھر کی اکثر ہی زمہداریاں سنبھال لی تھیں۔ حتیٰ کہ جب ابو نے سونیا کے لیئے میتھس کی ٹیوشن کا بندوبست کرنا چاہا تو اس نے فوراً ہی اپنی خدمات پیش کر دیں۔ وہ کچن میں امی کے پاس پوؤں پٹخ پٹخ کر روتی رہی کہ وہ علی سے نہیں پڑھے گی۔ دادی سے بھی احتجاج کیا مگر اس کی فریاد کہیں سنی نہ گئی۔ اسے علی سے چڑ تھی۔ علی کو بھی اس کی ہر بات پر اعتراض ہوتا۔ اس کے ڈرامے دیکھنے، ڈائجسٹ پڑھنے، گول گپے کھانے پر۔ یہ وہ چیزیں تھیں جنہیں وہ کسی صورت نہیں چھوڑ سکتی تھی اور علی کو عین ڈرامے کے وقت اسے پڑھانا یاد آتا تھا۔ دادی کہتیں۔

علی بیٹا سونیا کو گول گپے تو لا دو۔

وی کمال فرمانبرداری سے پیسے جیب میں ڈال کر باہر نکل جاتا۔ کچھ دیر بعد ہاتھ لٹکائے واپس

آ تا۔

نانو وہ تو چلا گیا۔

سونیا پاؤ ں پٹختی چیختی تو مزید ڈانڈ کھاتی۔ ایسے میں اس کی آ نکھیں ہزار والٹ بلب کی طرح جگمگا تیں۔ سب سے برو تو وہ سونیا کو اس وقت لگتا جب وہ سب کے درمیان بیٹھی کھکھلا رہی ہوتی وہ کسی جن کی طرح سر پر آن کھڑا ہوتا۔

وہ رات جو میں نے فارمولا یاد کرایا تھا وہ سناؤ زرا۔ اتنا اچانک سب کچھ بھک سے ذہن سے نکل جاتا۔ وہ فاتحانہ نظروں سے سب کو دیکھتا،

میں کہتا ہوں نا یہ کند ذہن ہے۔

تم ہو کند ذہن۔۔۔ جاہل۔۔۔ پینڈو۔۔۔ وہ جھر جھر آ نسو بہاتی۔

کیا ہو رہا ہے۔۔۔؟ وہ بڑے انہماک سے اسکول کا اکم کر رہی تھی جب وہ آیا۔ رات کے دس بج رہے تھے۔ اس وقت وہ ٹیوشن پڑھا کر آیا کرتا تھا۔ وہ خاموشی سے اپنا کام کرتی رہی۔

او ہو لوگ تو بہت ہی پڑھا کو ہو گئے ہیں۔

علی مجھے تنگ نہیں کرو۔۔۔ وہ جھنجھلا گئی۔

اچھا نہیں کرتا۔ مجھے دودھ گرم کر دو۔

تم خود کر لو۔

میں تو مہمان ہوں۔

اللہ رے ڈھٹائی۔ سونیا نے سر اٹھا کر دیکھا ہاتھ میں لفافہ تھا۔

یہ کیا ہے؟

تمہارے مطلب کی چیز نہیں ہے۔

تو پھر دودھ بھی خود ہی گرم کر لو۔۔۔

میں نانو کے پاس ہوں۔ وہ آرام سے کہہ کر چلا گیا۔ چار و نا چار وہ اٹھی۔ فریج سے دودھ نکال کر گرم کیا۔ پیالے میں بھر کر لے گئی۔ وہ دادی کے پاؤں دبا رہا تھا۔ اس نے پٹخنے والے انداز میں پیالہ میز پر رکھا،

او ہوں دودھ گر جائے گا۔ علی شیر نے بڑے پن کے ساتھ گھر کا۔ ساتھ ہی اگلا کام بتایا۔

وہ لفافے میں سے جلیبیاں نکال کر دودھ میں ڈال دو اچھی طرح بھیگ جائیں گی تب نانی کھائیں گی۔

اچھا دودھ جلیبیاں۔۔۔ لحاف میں سکڑی ہوئی دادی ہوشیار ہو کر بیٹھ گئیں۔

مجھے پتہ تھا نانو آپ کو بہت پسند ہیں۔ کیسی سعادتمندی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

تم ابھی تک کھڑی ہو دادی کا اتنا سا کام بھی نہیں کر سکتیں۔ وہ شرارت سیس ونیا کو دیکھتے ہوئے بولا۔ سونیا چڑ گئی۔ جلیبیاں ڈال کر تیزی سے باہر نکل آئی۔

بدتمیز بیہودہ مجھ سے کہہ رہا تھا تماہرے کام کی چیز نہیں۔

کتاب کھولے وہ مسلسل بڑبڑا رہی تھی۔

اندر سے مسلسل اونچا اونچا بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ کبھی اپیا کی آواز غالب آتی تو کبھی احمر کی۔ مگر دروازہ بند ہونے کی بنا پر الفاظ ٹھیک سے سمجھ نہ آتے تھے۔ فطری تجسس کے ہاتھوں اگر رباب نے اٹھنا بھی چاہا تو گود میں بیٹھے عمر نے اسے ایسا کرنے نہیں دیا۔ یوں بھی وہ بہن بھائی کے معاملات میں زیادہ دخل نہیں دیتی تھی۔ مگر اس بار لاشعوری طور پر اسے یقین سا تھا کہ معاملے کا تعلق خود اس کی ذات سے ہے۔ اپیا جب سے کالج سے لوٹی تھیں یونہی غصے میں بھری ہوئی تھیں۔ رباب نے پوچھا بھی تو ٹال گئیں۔ احمر کے گھر آتے ہی انہوں نے اسے گھیر لیا۔ کھانا بھی نہیں کھانے دیا۔ وہ بس کمرے میں لے گئیں۔ وہ ٹیبل سجائے منتظر تھی۔ آج کتنے دنوں بعد تو احمر لنچ پر گھر آئے تھے۔ دروازہ کھلا تو چند اڑتے الفاظ رباب کے کانوں سے ٹکرائے۔

آپ جو بھی کرنا چاہتی ہیں کر لیں مگر میرا فیصلہ یہی ہے۔ احمر کی آواز مضبوط اور اٹل تھی۔

یاد رکھنا احمر اگر رباب کے ساتھ کوئی بھی زیادتی ہوئی تو میں تمہیں معاف نہیں کروں گی۔ اپیا نے چیخ کر کہا۔ جواباً احمر نے کائی جواب نہیں دیا تھا۔ وہ تیزی سے باہر نکلے۔ رباب کو دیکھ کر ٹھٹھکے۔ پھر لمبے لمبے ڈگ بھرتے گھر سے ہی نکل گئے۔ رباب انہیں روک بھی نہیں سکی۔ بس ششدر سی دیکھتی رہی۔ پھر پلٹ کر اپیا کے کمرے کی طرف دیکھا۔ دروازہ کھلا تھا مگر وہ باہر نہیں آئی تھیں۔ وہ مضطرب سی عمر کو اٹھائے اندر چلی آئی اور دھک سے رہ گئی۔ اس نے کبھی اپیا کو روتے نہیں دیکھا تھا مگر آج وہ رو رہی تھیں۔

کیا ہو گیا اپیا؟ اس نے عمر کو گود سے اتارا اور ان کی طرف لپکی۔ عمر رو پڑا۔

کچھ نہیں۔۔۔ وہ چہرہ چھپا کر آنسو صاف کرنے لگیں۔

کچھ تو ہے۔ احمر سے کیا بات کر رہی تھیں۔ وہ کیا کرنے لگے ہیں؟ اس کا دل سینے میں زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

کچھ نہیں رباب جاؤ انہوں نے ٹالنا چاہا۔ تمہارا معاملہ نہیں ہے۔

میرا معاملہ ہے۔۔۔ میرا معاملہ ہے اپیا میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کچھ ہونے والا ہے۔ وہ دبی دبی آواز میں چیخ اٹھی۔

رباب میری جان کچھ بھی نہیں ہونے والا۔ ٹینس مت ہو۔ تمہاری حالت۔۔۔ انہیں پہلی با اپنی بیاختیاری پر غصہ آیا اس لیئے اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھام کر پیار سے کہنے لگیں۔ لیکن رباب نے ان کے دونوں ہاتھ جھٹک دیئے۔

مجھ سے کچھ مت چھپائیں۔ کچھ نہیں ہوا میری حالت کو۔۔۔۔ مجھے بتائیں احمر کیا کہہ کر گئے ہیں۔۔۔ وہ مجھ سے دور جا رہے ہیں۔۔۔ آج سے نہیں کئی مہینوں سے محسوس کر رہی ہوں۔ صرف کاغز کا رشتہ نہیں ہے ہمارا۔ محبت کرتی ہوں ان سے۔ ان کی آنکھوں کا اشارہ پہچانتی ہوں۔ وہاں میری شبیہ مٹتی جا رہی ہے لیکن کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لی تھیں کہ شاید کوئی معجزہ ہو جائے۔ بتائیں اپیا کون ہے؟ کون ہے وہ جو مجھ سے میرا احمر چھین رہی ہے؟

میں نہیں جانتی وہ کون ہے۔ لیکن میں نے کئی بار اسے احمر کے ساتھ دیکھا ہے۔ اپیا کو محسوس ہوا

اب کچھ بھی چھپانا ناممکن ہے۔

میرا خیال تھا کوئی کولیگ ہوگی۔ایک دوبار دیکھا۔لوگوں نے بھی اشارہ کیا۔مگر میں جھٹلا گئی ایسا کیسے ہوسکتا ہے وہ تو تم پر جان دیتا ہے۔تمہاری زرا سی تکلیف پر تڑپ اٹھتا ہے۔پھر کسی اور کی طرف کیسے متوجہ ہوسکتا ہے۔۔۔مگر آج۔انہوں نے کرب سے آنکھیں بند کرلیں وہ اس سے شادی کرنا چاہتا ہے۔

ایک بم تھا جو اس کے حواسوں پر پھٹا تھا۔تمام تر خدشوں کے باوجود دل کے کسی کونے میں خواہش ہمک رہی تھی کہ اپیا اس کے خدشوں کو جھٹلا دیں۔وہ بیقینی سے اپیا کو دیکھے گئی۔عمر اس کی گود میں آنے کے لیئے مچل مچل کر رو رہا تھا۔

رباب کو لگا وہ لمحہ بہ لمحہ کسی گہری کھائی میں گر رہی ہے۔احمر اس کے دونوں ہاتھ تھامے اس کے عین سامنے بیٹھے کس بیچارگی سے پوچھ رہے تھے،

رباب بتاؤ میں کیا کروں؟

رباب نے آنکھوں میں در آنے والی نمی پلکیں جھپ جھپک کر پیچھے کرتے ہوئے انہیں دیکھنے کی کوشش کی۔مگر اسے لگا کہ احمر اس سے بہت دور ہیں۔اتنے کہ اس کی آنکھیں انہیں دیکھ نہیں پا رہی۔وہ انہیں پکارنا چاہتی تھی مگر سارے الفاظ بے زبانی کی دھند میں گھرے بے بس کھڑے تھے۔رباب نے اپنے حواس یکجا کرتے ہوئے پھر سے سوچنے کی کوشش کی۔

احمر نے ابھی کیا کہا ہے؟

مگر اسے لگ رہا تھا وہ ایک خلا میں معلق ہے نہ ودموں تلے زمین نہ سر پر آسمان۔بس ایک چلچلاتی دھوپ ہے جو اس کے تن من کو جھلسائے جا رہی تھی۔ٹکر ٹکر احمر کو دیکھے گئی۔

وہ رونا نہیں چاہتی تھی مگر آنسو تھے کہ گالوں پر لڑھکتے آ رہے تھے۔مجھے اس سے محبت ہوگئی ہے۔

باقی سب کچھ بھول کر بس یہ ایک جملہ اس کے ذہن میں بار بار گونجنے لگا۔

رباب کا دل چاہا وہ انہیں یاد دلائے۔آج سے ٹھیک چار برس پہلے۔ایک خوشبوؤں بھری شام میں موم شمعیں جلاتے ہوئے بے خیالی میں ایک لڑکی تم سے ٹکرائی تھی۔

رباب۔۔۔رباب تھا اس لڑکی کا نام۔

جسے پانے کے لیئے تم دیوانوں کی طرح پھرتے تھے۔لوگ آج بھی رشک کرتے ہیں جیسا رشتہ رباب کا جڑا یوں آنا فانا جیسے اس کا نصیب کھلا کسی اور بہن کا نہیں کھلا۔تم اس سے بھی محبت کرتے تھے۔تم اس سے بھی محبت کے دعوے کرتے تھے اور تمہاری اس ایک بات پر ایمان لا کر۔اسی ایک جملے کی انگلی تھام کر اس لڑکی نے تمہارے ساتھ چار برس اس چھت کے نیچے گزارے تھے۔تمہارے دکھ میں وہ اپنے سارے سکھ بھلا کر شریک ہوئی تھی۔

تم تھک جاتے تو تمہارے پاؤں دباتی تھی۔سر میں درد ہوتا تو اس کی نرم انگلیوں میں ساری محبت سمو جاتی۔تمہارے سونا جاگنے کھانے پینے کا خیال خود سے بڑھ کر رکھتی تھی۔

تم رات کے پچھلے پہر بھی پکارتے تو سارے تھکن بھوک کر تم پر نثار ہو جاتی۔اس نے تمہیں بیثمر

بھی نہیں رہنے دیا۔ تمہارا بچہ۔۔تمہارا نام۔۔تمہاری شناخت بن کر اس دنیا میں آیا اور جو اس کی کوکھ میں سانس لے رہا ہے۔ سجدے کا حکم ہوتا تو سجدہ بھی کرتی۔

اس کی ساری محنت ساری ریاضت ک صلہ یہ ہے۔ ایک پل نہیں لگا کہ تم نے اسے آسمان سے زمین پر لا پٹخا۔ بے مول کر دیا۔ کس غرور سے سر اٹھائے وہ دنیا کی نظر سے نظر ملا رہی تھی۔ اب لگتا ہے دنیا اس پر ہنس رہی ہے۔۔ بے وقوف لڑکی۔ اعتبار کیئے بیٹھی تھی۔ اب اس کا سارا آتبار کرچی کرچی ہو کر اس کے سامنے پڑا ہے۔۔ رستوں میں بکھر گیا ہے اور وہ سوچ رہی ہے۔

زیست صحرا کا سفر اور کرچی کرچی راستے۔ تمہیں اس پر ذرا بھی ترس نہ آیا۔ اس پر اس کی محبت پر ترس کھاتے۔ ایک نظر اپنے معصوم بچے کو دیکھ لیتے۔ ایک بار اس نئی روح کے متعلق ہی سوچ لیتے جو اس کے وجود میں پرورش پا رہی ہے۔ جس نے آنکھ کھول کر ابھی اس دنیا کو دیکھا بھی نہیں ہے۔

میں بہت مجبور ہوں رباب۔۔۔

ہاں۔۔۔اس نے ایک لمبی سانس کھینچ کے خود کو اپنے زندہ ہونے کا یقین دلایا۔ بس یہی فرق ہے تب تمہارے چہرے پر شرمندگی کے سائے نہیں لرزتے تھے۔ میری محبت فخر بن کر تمہاری آنکھوں سے جھلکتی تھی۔

کچھ تو بولو۔۔۔وہ جیسے اس کی خاموشی سے خائف ہو کر بولے۔

رباب کو ایک بار پھر بے سائبانی کے احساس نے گھیر لیا۔ اس کا دل چاہا وہ انپڑھ جاہل عورتوں

کی طرح احمر کا گریبان تھام لے انہیں جھنجھوڑے۔ چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لے۔ اس عورت کو بددعائیں اور گالیاں دے مگر وہ کچھ بھی نہ کر سکی۔ آہستگی سے ہاتھ چھڑائے اور اندر چلی گئی۔ اس کے اٹھتے گرتے قدموں سے صدیوں کی تھکن آ لپٹی تھی۔

رباب۔۔۔نیم تاریکی میں اپیا کی آواز گونجی۔ پورا کمرہ اندھیرے کی زد میں تھا۔ پھر چٹ کی آواز کے ساتھ ہی کمرہ روشن ہو گیا۔

وہ بیڈ کے ایک کونے میں ساکت بیٹھی تھی۔ پورا دن گزر گیا تھا۔ وہ کمرے سے باہر نہیں نکلی تھی نہ ہی عمر کو دیکھا تھا۔

رباب۔۔۔اس کی حالت سے خوفزدہ ہو کر اپیا نے اسے جھنجھوڑ ڈالا۔ وہ جو ملحہ لمحہ کسی کھائی میں گرتی جا رہی تھی ایک دم سہارے کے لیئے اپیا کا ہاتھ تھام کر جکڑ لیا۔

احمر۔۔۔بند لبوں نے سرگوشی کی اور وہ متوحش سی ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ وہ تو لاؤنج میں احمر کے پاس تھی وہ اس سے کچھ کہہ رہے تھے۔

کیا کہہ رہے تھے۔۔۔؟ اس نے دکھتے دماغ پر زور ڈالا۔ الفاظ کوڑیالے سانپ کی طرح اسے ڈسنے لگے۔ وہ لب جو کبھی محبتوں کے گیت گاتے تھے کس سفاکی سے کوڑے برسا کر چلے گئے تھے۔

وہ بے سہارا ہے اسے سہارے کی ضرورت ہے میری ضرورت ہے۔

اور مجھے۔۔۔؟ اس نے نجانے کس سے سوال کیا تھا۔

اتنی بڑی دنیا۔۔۔اتنی بڑی دنیا میں اسے ایک تم ہی ملے سہارا دینے کے لیئے۔

وہ اپیا کی گود میں سر رکھ کر لمبے لمبے سانس لینے لگی۔مگر سینے میں اٹکی سانس کو کھینچنے کے لیئے اسے بڑہ مشقت کا سامنا کر پڑ رہا تھا۔

میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں کروں گا تمہارے پورے حقوق تمہیں ملیں گے۔ابھی کچھ دن وہ یہاں رہے گی پھر میں اسے علیحدہ گھر لے دوں گا۔

رباب نے سر اٹھا کر بیڈروم پر ایک نگاہ دوڑائی۔

یہاں۔۔۔وہ یہاں رہے گی۔میری نظروں کے سامنے۔۔۔چلے پھرے گی۔ہنسے مسکرائے گی۔تمہیں دیکھ کر شرمائے گی۔تم اسے چھوو گے۔دیکھو گے یہاں اس گھر میں۔کوئی تیز دھار خنجر سے اسکا دل لخت لخت کر رہا تھا۔

وہ اضطراری انداز میں اٹھی الماری کھول کر سامان بیڈ پر ڈھیر کرنے لگی۔

رباب۔۔۔اپیا ششدر رہ گئیں۔

وہ اسے لے کر آ رہا ہے یہاں اس گھر میں اور میں خود کو دھوکا دیتی رہی کہ یہ تو میرا گھر ہے۔مگر جب گھر والا ہی میرا نہیں تو گھر کا کیا سوال۔وہ زیر لب بڑبڑاتی سامان باندھ رہی تھی۔

رباب یوں میدان مت چھوڑو۔اپیا نے اسے سمجھانا روکنا چاہا۔مگر رباب کے اندر آگ سلگ رہی تھی۔جمعے کو وہ اسے یہاں لا رہا ہے۔

کیسے لاسکتا ہے وہ اسے یہاں۔۔۔احمر نے کیا کہا ہے تم سے۔

اس نے کہا رباب سانس لینا بند کر دو۔اس نے کہا رباب دل سے کہو دھڑکنا چھوڑ دے۔اس نے کہا رباب مر جاؤ رباب مر گئی۔رباب مر گئی اپیا۔

عمران کو کندھے سے لگا کر وہ گھر سے نکل گئی تھی شاید ہمیشہ کے لیئے۔

آخری مارچ کے دن تھے۔فضاء میں کو شبوئیں سی رچی بسی محسوس ہوتیں۔باہر گرمی میں شدت آ رہی تھی۔اندر کمرو کی تاریکی نیم گرمی کے ساتھ مل کر غنودہ سی کیفیت طاری کر دیتی۔دو پہریں لمبی اور اونگھتے ہوئے گزرتیں۔روشندانوں میں چڑیا ہلچل مچائے رکھتیں۔ان کی چہچہاٹوں میں بلا کی معنی خیزی تھی۔وہ گھونسلے بناتی تھیں کہ یہ انڈے دینے کا موسم تھا۔رباب جھاڑو دیتے دیتے جھنجھلانے لگیت۔

اتنے تنکے۔۔۔وہ کینہ توز نگاہوں سے روشندان کی طرف دیکھتی۔سونیا گھبرا کر اس کا ہاتھ تھام لیتی۔

جانے دیں آپی۔آخر کہیں نہ کہیں تو انہیں اپنا گھر بنانا ہے۔۔۔

رباب ہاتھ چھڑا کر کچھ بڑبڑاتی اور باہر نکل جاتی۔سونیا سر اٹھا کر روشندان سے چھن چھن کر اندر آتی رشونی می پھولے پھولے پروں والی چڑیا اور چڑے کی سرگرمیاں دیکھنے لگتی۔تو دھیان خود بخود رباب کی طرف چلا جاتا۔اسی طرح تنکا تنکا جوڑ کر گھونسلا بنایا تھا۔رباب اور احمر نے۔وہ گھونسلہ تنکا تنکا ہی بکھر گیا۔شاید اسی لیئے انہیں فرش پر تنکے دیکھ کر وحشت ہوتی تھی۔نر چڑیا کی چونچ سے تنکا پھسلا۔نہ کوئی آہٹ نہ ہلچل۔مگر گھونسلے کا کوئی ایک کنارہ ضرور ہی ٹوٹا تھا۔

تبھی تو تنکے بکھرتے چلے جا رہے تھے۔ابھی آپی اندر آئیں گی اور یہ تنکے دیکھ کر وحشت ان کی آنکھوں میں جاگے گی۔

سونیا نے کروٹ بدلیا ور بازو بڑھا کر تنکے مٹھی میں بھر لیئے۔

گھونسلے کیوں بکھر جاتے ہیں؟

ایک تپتی سوچ جون جولائی کی دوپہر کی طرح اس کے اندر پھیلتی چلی گئی۔کمرے کی خاموشی میں چڑیا کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ ارتعاش ڈال رہی تھی۔کھلے دروازے سے ایک اور آواز اندر آنے لگی۔حمنہ آپی نے کبوتروں کا ڈربہ کھول دیا تھا۔پھر ننھے احد کی قلقاریاں۔وہ بیاختیار اٹھی۔پاؤں میں چپک اڑسیا ور دروازے میں چلی آئی۔کھلا سا صحن کبوتروں کی پھڑ پھڑاہٹ سے آباد ہو گیا تھا۔سرسبز و شاداب کونپلیں امرود کے درخت پر کھلنے لگی تھیں۔کیاریوں می سفید کلیا نکل آئی تھیں۔احد کبوتروں کے پیچھے لپکتا۔چند قدم جوش میں اٹھاتا اور گر جاتا۔رباب تالی بجا کر بک اپ کرتی۔

کم ان بوائے۔۔۔اسٹینڈ اپ۔

اور یونہی اٹھتے گرتے وہ ایک دن بڑا ہو جائے گا۔سونیا نے اچانک سوچا۔

اک نیا آسمان ایک نئی دنیا اس کے سامنے ہوگی۔پرندے اڑنا سیکھ جائیں تو گھونسلے خالی ہو جاتے ہیں۔تب۔۔تب یہ کیا کریں گی؟

خود سے سوال کرتے کرتے اس نے رباب کی طرف دیکھا۔گویا جواب اسے دینا تھا۔وہ بھی

ایک دم چپ سی ہو کر احد کو دیکھ رہی تھی۔

آس کی اس نازک سی ڈور پر کب تک چل پائیں گی رباب آپی۔۔۔کس امید پر وہ گھر چھوڑا تھا۔وہ آواز دے گا، پکارلے گا، منالیگا۔مگر ڈیڑھ سال ہونے کو آیا اس نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔آپ کی محبت اتنی بے وقعت کیسے ہوگئی۔اور محبت کے دعوے کرنے والے اتنی آسانی سے کیسے بدل سکتے ہیں کیسے مکر سکتے ہیں۔ان قسموں سے۔وعدوں اور جزبوں سے۔اس مقدس رشتے سے جو سینکڑوں لوگوں کی موجودگی میں اللہ کو گواہ بنا کر باندھا جاتا ہے۔

رباب تو ایک طرف کسی کو بھی یقین نہیں تھا کہ رباب پر جان دینے والا احمر یوں بدل جائے گا کہ اولاد کی محبت بھی اس کے پیروں کی زنجیر نہ بن سکے گی۔اور یہ ننھا فرشتہ۔۔۔سونی نے احد کو دیکھا۔

جس نے یہیں آنکھ کھولی اور یہیں پاؤں پاؤں چلنا سیکھ رہا ہے۔جانتا ہی نہیں کہ اس پر کیا بیتی ہے۔

دونوں ہاتھ عقب می باندھ کر وہ اپنی اضطراب پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔

انتظار کا جو دیا ہر روز جلا کر سرکش ہواؤں کے سامنے رکھتی ہیں رباب آہی۔اس کا انجام کیا ہوگا۔انجام سامنے ہی تو ہے۔

حمنہ نے نجانے رباب سے کیا پوچھا تھا اس نے سر نفی میں ہلا کر افق پر چھائی لالیوں پر نظریں جما دیں۔

کسے پیغام بھیجتی ہیں جو منتظر ہی نہیں اور یہ بیمہر ہوائیں۔کون جانیں آپکا پیغام وہاں پہنچاتی بھی ہیں یا یہاں وہاں رول آتی ہیں۔

سونیا نے تاسف سے سوچا پھر آگے بڑھ کر دونوں بازو رباب کے گرد تان دیئے۔

وہ ایک دم چونکی۔

کیا ہوا؟

کچھ بھی نہیں َ

تو پھر یہ لاڈ کیوں؟

ویسے ہی۔

یہ کیا ہے؟ رباب نے اسکی مٹھی کو چھوا۔سونیا نے گھبرا کر مٹھی کھولی تو تنکے بکھر گئے وہ شرمندہ سی ہوگئی۔

تب ہی برآمدے میں رکھے فون کی بیل چیخ اٹھی۔

حمنی زرا دیکھو۔۔۔رباب کے لہجے میں بیتابی در آئی۔حمنہ سی ایل آئی پر نمبر دیکھ کر پکاری۔

ہارون کا ہے۔

سونیا نے رباب کے چہرے پر بکھرتے مایوسی کے رنگوں کو دیکھا۔پھر دادی اور امی کو بلانے اوپر چلی گئی۔

ڈیڑھ سال میں کچھ بھی نہی بدلا وہی مسلے۔وہی پریشانیاں وہی دادی کے وظائف۔امی اور حمنہ

خود کو ایک دوسرے سے بڑھ کر کاموں میں الجھاتی تھیں۔سونیا اور علی شیر کالج میں تھے۔ ہارون کا پنڈی سے فون آتا۔وہ بھی تو ابو کا بیٹا تھا جس حوصلے اور بردباری سے ابو حالات کا مقابلہ کر رہے تھے۔وہی تحمل اور بردباری ہارون کے مزاج میں بھی تھی۔اب تو اس نے پارٹ ٹائم جاب کر لی تھی رباب کے لیئے علیحدہ سے خرچا بھجواتا۔

تم فکر مت کرنا میں ہوں نا۔

اور رباب فکر کیسے نہ کرتی۔دو بچے تھے۔علی اسکول جانے لگا تھا۔اسکا خرچہ بھی بڑھ گیا تھا۔

کاش۔۔۔کاش اتنا پڑھ لیا ہوتا کہ آج اپنے پیروں پر تو کھڑی ہوتی۔دن رات کی جلن کڑھن تو اب مقدر ہو گئی تھی۔

ایسے میں ثانیہ نے گویا وقت کی نزاکت کو سمجھ کر بی ایڈ میں ایڈمشن لے لیا۔اگرچہ ایڈمیشن کے لحاظ سے وہ اوورایج ہو چکی تھی مگر شام کی کلاسز میں ڈبل فیس کے ساتھ ایڈمیشن مل گیا تھا۔ابو نے بھی حالات کو دیکھتے ہوئے اجازت دے دی۔نو مہینے پلک جھپکتے میں گزر گئے۔ادھر اسکا رزلٹ آیا۔ادھر گورنمنٹ ویکینسیز نکل آئیں اور وہ گورنمنٹ ٹیچر بن گئی۔جس وقت پانچ ماہ کے بعد اسے اکٹھی تنخواہ ملی تو جہاں اس نے خدا کا شکر ادا کیا تھا وہیں سینکڑوں بار اپنے بروقت کیئے گئے فیصلے کو بھی سراہا تھا۔شاید پہلا قدم اٹھانے کی ضرورت ہوتی ہے پھر اللّٰہ خود بخود راستے کھول دیتا ہے۔وہ اب مطمئن تھی اور کوش بھی۔صبح جب افراتفری میں تیاری ہو کر وہ بس پکڑنے کو بھاگتی تو حمنہ اسے چپکے چپکے کچن کی کھڑکی سے دیکھا کرتی۔

کاش۔۔۔کاش رباب۔۔۔ہم بھی کچھ کرنے کے قابل ہوتے حمنہ نے تو میٹرک کے بعد ہی تعلیم چھوڑ دی تھی۔

تم ٹھیک کہتی ہو آج ہاتھ میں کچھ ہوتا تو یوں اپنا آپ بوجھ نہ لگتا اور کچھ نہیں تو اپنے بچوں کا ہی بوجھ اٹھا لیتی۔عمر کو ناشتہ کراتے ہوئے رباب کے لہجے میں تاسف سا گھل گیا۔کل تک لوگ اس کی قسمت پر رشک کرتے تھے آج وہ کو دا پنے اوپر ترس کھا رہی تھی۔

عورت کے ہاتھ می کوئی نہ کوئی ہنر ضرور ہی ہونا چاہیئے۔

رباب کو دیکھ کر حمنہ نے ایک بار پھر سوچا تھا۔

پورے گھر کی دھلائی کے بعد وہ نل تک آئی۔پورا نلکھول۔صابن مل مل کر پاؤں دھونے لگی۔ شام کے نارنجی رنگ در و دیوار پر گرنے لگے تھے۔ننھی چڑیاں امرودوں کے درختوں پر بیٹھی چوں۔۔۔چاں کر رہی تھیں۔

سفید جھاگ نالی میں جا رہا تھا۔

باولی ہوئی ہے لڑکی ساری ٹکیا ضائع کر دی۔وہ سنی ان سنی کر گئی۔

حمنہ بڑے سے پیالے میں مہندی گھولے بیٹھی تھی۔اس کے بال اب تیزی سے سفید ہونے لگے تھے۔ماہا تیزی سے پاؤں صاف کر کے سیاہ چپل میں پھنساتی اندر چلی گئی۔

ماہا کو کیا ہوا ہے؟ ثانیہ ابھی ابھی نہا کر نکلی تھی۔اب اپنے لمبے بال تو کیے سے خشک کرتے ہوئے وہاں آ کھڑی ہوئی تھی جہاں سے دھوپ بلی کی طرح زقند لگا کر دیواروں پر جا چڑھی تھی۔

دورہ پڑا ہے۔۔۔سبزی بناتے ہوئے امی نے بیزاری سے کہا۔اس کے نت ن ءء بدلتے موڈ امی کو یونہی بیزار کرتےتھے۔دادی کے ساتھ تو اس کی بنتی ہی نہ تھی۔وہ بھوڑی اکھڑ، بدتمیزی کی حد تک صاف گو وہ۔باقی بہنوں نے یکسر مختلف تھی۔آج تو صبح ہی سے موڈ خراب تھا،

حمنہ آپی نے کہا۔ماہا آٹا گوندھ دو۔۔۔

ماہا بھر بھر ڈونگے پودوں کو پانی دیدی رہی۔

حمنہ نے آٹا گوندھا، پراٹھے بنائے،چھٹی کا دن تھا۔ثانیہ نے آلو کی ترکاری اور آملیٹ بھی بنالیا۔اسے بھی ناشتے کے لیئے پکارا۔وہ بیٹھی چڑیوں کو رات کی بچی روٹی ڈالتی رہی۔علی شیر نے آتے جاتے چھیڑا۔

ماہا آپی کونسا چلہ کاٹ رہی ہیں؟

وہ کاموش بیٹھی پاؤں ہلاتی رہی۔سب ناشتے سے فارغ ہوئے تو کچن میں جا کر کھٹ پٹ کرنے لگی۔ساری دوپہر اونگھتے یا۔ڈائجسٹ پڑھتے گزار دی۔شام کو اٹھی تو پائپ لگا کر سارا صحن۔برآمدے اور سیڑھیاں تک دھوڈالیں۔

امی حمنہ کے بالوں میں مہندی لگانے لگی تھیں۔

رباب تم لگواؤ گی۔انہوں نے پوچھا۔

شام کے وقت لگواؤ گی تو دھوگی کب۔تم صبح لگواتی حمنہ بچی۔ایویں ٹھنڈ لگ گئی تو۔۔۔دادی نے پیار سے سرزنش کی۔

صبح سے تو اسٹور میں گھسی تھی سارا صاف کر ڈالا۔خوامخواہ تھکاتی ہو خود کو۔امی نے بھی ڈانٹا۔

مصروفیت اچھی چیز ہے امی فارغ بیٹھ کر کیا روں؟

وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔

رباب اسے ایک نظر دیکھ کر رہ گئی۔وہ جانتی تھی۔جب بھی اس کے لیءے آنے والا رشتہ واپس جاتا ہے وہ خود کو یونہی ہلکان کرتی ہے۔

مصروفیت کی آڑ میں خود کو سب سے چھپائے پھرتی ہے۔گویا وہی مجرم ہو۔امی کی خاموشی۔ابو کی اس کو دی جانے والی بے وجہ توجہ اور محبت،دادی کی کھا پی کر واپس جانے اور نخوت سے انکار کہلوا دینے والوں کو دی جانے والی صلواتیں۔وہ سب سے بھاگتی تھی۔وہ ماہا کی طرح چیخ چیخ کر یا برتن پٹخ پٹخ کر اپنا غصہ نہیں نکال سکتی تھی سو خود کو بیوجہ مختلف کاموں میں الجھائے رکھتی،

ماہا کمرے سے نکلی اور وہیں ان کے پاس بیٹھ کر پاؤں کے ناخنوں پر نیل پالش لگانے لگی۔امی نے ایک نظر دیکھا اور خاموش ہو رہیں۔دادی سے رہا نہ گیا فوراً ٹوک دیا۔

کیا کرتی ہو نماز نہیں پڑھو گی؟

وہ بینیازی سے سر جھٹک کر ناخن سجاتی رہی۔دادی کو تاؤ آ گیا۔اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

نا۔۔۔تکلیف کیا ہے تجھے میں پاگل ہوں جو بک بک کرے جا رہی ہوں۔

دادی جان جانے دیں۔ثانیہ نے تولیہ تار پر پھیلا کر آہستگی سے کہا۔

نا کچھ منہ سے پھوٹے بھی تو۔ایسی کیا آفت آن پڑی ہے۔دادی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا

۔ماہا اپنے گورے پاؤں پر لگی نیل پالش دیکھتی رہی۔پاؤ ایک دم سج سا گیا تھا۔

شریف لڑکیوں کے یہ لچھن نہیں ہوتے۔سارا دن رسالے پڑھ لیئے،اونگھ لیا۔دل چاہا تو منی کی لیپا پوتی سیکھنے کے لیئے اسکول میں داخلہ لے لیا۔سسرال میں کون اٹھائے گا تمہارے یہ نخرے؟

سسرال۔۔۔ہونہہ۔۔۔ماہا ایک دم زہر خند لہجے میں ہنسی۔سویٹ دادی سسرال جائیں گے تو نا۔

عمر اس کی رطف ہمک رہا تھا اس کو گود میں اٹھا کر اوپر چڑھ گئی۔مگر اس کی زہریلی ہنسی حمنہ کے رگ و پے میں سرایت کر گئی۔اسے لگا ماہا اسے سنا کر گئی ہے۔

مت چھیڑا کریں۔۔پتہ تو ہے اسکا۔ثانیہ جھنجھلا گئی۔

دماغ خراب ہے اسکا۔ہر روز نئی فرمائش کہاں سے پوری کروں۔۔۔؟امی حد درجہ بیزار تھیں۔

اور میں نے کی اس کے گولی مار دی تھی۔کیسے چٹاخ پٹاخ جواب دے گئی۔۔۔آنے دو اس کے باپ کو۔دادای بڑبڑاتی رہیں۔

زندگی عذاب ہو گئی ہے میری تو۔۔نہ دن کا سکون نہ رات کا چین،مجھے کوئی شوق ہے اسے گھر بٹھانے کا۔آج کوئی اچھا رشتہ مل جائے تو بیاہ دوں۔پر قسمت ہی خراب ہے۔ایک بیاہی تھی کن ارموں سے کیا کیا نا دیا تھا جہیز میں۔کیا ہوا؟اجڑ کر گھر آ بیٹھی۔دوسری کے لیئے کوئی رشتہ ہی نہیں ملتا۔بیٹا الگ ضد باندھے بیٹھا ہے کہ جب تک بہنیں اپنے گھروں کی نہیں ہو جاتیں

میں شادی نہیں کروں گا۔

امی کو اب چپ کرانا مشکل تھا بات کوئی بھی ہوتی تان ان کے رشتوں پر آ کر ٹوٹتی۔ حمنہ کے چہرے کے تاثرات ایک دم جامد ہوگ ء۔ رباب لب بھینچے نلکے پر بیٹھی چڑیا کو دیکھ رہی تھی۔

ثانیہ کاپیاں اٹھائے اوپر آئی تو ماہا دونوں بازو آنکھوں پر رکھے چت چارپائی پر لیٹی تھی۔ دوسری چارپائی پر سونیا بیٹھی اپنے کالج کا کام کر رہی تھی۔ گاہے بگاہے نظریں اٹھا کر ماہا کو دیکھ لیتی۔

تمہیں علی شیر بلا رہا ہے۔

اب اس کو کیا کام ہے۔ سونیا چڑ گئی۔ علی شیر کے ساتھ اس کے تعلقات ابھی بھی کشیدہ ہی تھے۔

یہ تو وہی جانے۔۔۔ وہ کاپیاں ڈھیر کر کے بیٹھ گئی۔

نہیں جاتی میں۔۔۔

مت جاؤ۔۔۔ ثانیہ نے کندھے اچکائے۔ وہ کچھ لمحے بڑبڑاتی رہی۔

دادی کا لاڈلا۔۔۔ چمچا جیسے الفاظ کان سے ٹکراتے رہے۔ پھر وہ کتاب پٹخ کر نیچے چلی گئی۔ انکار کی جرات کہاں تھی۔ ابھی دادی کی پکاریں آنے لگتیں۔ وہ بھی سونیا کو تنگ کرنے کے لیئے دادی سے اس کی شکایتیں لگایا کرتا تھا۔ عینک نکال کر ناک کی پھننگ پر ٹکا کر کاپی کھولتے ہوئے ثانیہ نے ماہا کو دیکھا پھر ناصحانہ انداز میں کہنے لگی۔ میں نے کہا تھا ماہا اپن ء لیئے کسی راستے کا تعین کر لو۔ ابھی وقت ہاتھ میں ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے کورسز وقت گزاری کا زریعہ ہو سکتے ہیں میرے ساتھ ہی پروفیشنل ڈگری لے لی ہوتی تو۔۔۔ وہ زرا سا رکی تو ماہا بازو ہٹائے بغیر ہی

ترخ کر بولی تھی۔

یہ چار پانچ ہزار کما کر تم کونسا تیر مار رہی ہو۔۔۔؟

بے مقصد زندگی یونہی انسان کو چڑچڑا بنا دیتی ہے۔ ثانیہ اس کی بات کا برا مانے بغیر یونہی تاسف سے سر ہلاتے ہوئے بولی۔

تم کیا باور کرانا چاہتی ہو۔۔۔؟ ماہا اٹھ کر بیٹھ گئی اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

کچھ بھی نہیں صرف تمہاری بات کا جواب دینا چاہتی ہوں۔ یہ صرف چار پانچ ہزار نہیں ہیں۔ یہ چند نوٹ مجھے احساس کمتری کے اس خول سے باہر نکالتے ہیں جس میں حمنہ اور رباب آپی گرفتار ہیں۔ یہ بتاتے ہیں کہ میں کسی پر بوجھ نہیں ہوں۔ اس قابل ہوں کہ کسی کے سامنے ہاتھ پھیلانے کے بجائے کسی کی ضرورت پوری کر سکوں۔ مجھے اب اپنا آپ برا نہیں لگتا نہ ہی فالتو لگتا ہے۔ نہ مجھے اپنی شادی کا انتظار ہے۔ قدرت نے ہمیں اس لیئے پیدا نہیں کیا کہ ہم راتوں کو چھپ چھپ کر روتے رہیں اور اپنے رب سے شادی کی دعا کریں۔ کیوں ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھے رہیں جبکہ ہمارے پاس بہت کچھ ہے۔ بہت کچھ کر سکتے ہیں ہم لوگ، شادی کو اپنی زندگی کا واحد مسلہ مت بناؤ۔ قسمت میں ہونا ہوئی تو ہو جائے گی۔ زندگی اور موت کی رطح اس پر بھی ہمارا کوئی اختیار نہیں۔ لیکن جو وقت ہمارے اختیار میں ہے اسے تو بہتر استعمال کر سکتے ہیں۔ عورت فائنانشلی اسٹرانگ ہو تو آدھے مسلے حل ہو جاتے ہیں۔ تمہاری اپنی بھی ایک زندگی ہے اسے کیوں ضائع کرتی ہو۔

اسے سنتے سنتے ماہا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

تمہیں احساس کمتری نہیں ہوتا جب تمہاری سہیلیاں گودوں میں بچوں کو لیئے آتی ہیں۔۔۔؟

جس بات پر اختیار ہی نہیں اس پر کڑھنا کیوں۔ یوں بھی میرے پاس اب کرنے کو بہت کچھ ہے۔ابھی تو میں ایم اے کی تیاری کرنے لگی ہوں۔اس کے بعد شام کی کلاسز میں ایم ایڈ میں ایڈمیشن لوں گی۔ یوں میرے تو پنج سالہ پروگرام می شادی کا کوئی پروگرام ہی نہیں۔ وہ بے نیازی سے کہتے ہوئے عنک ٹھیک کرتے ہوئے کاپی کھولنے لگی۔

ماہا نے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔صاف ستھرے پاؤں ،شفاف جلد۔ لمبے بالوں کی مناسب تراش خراش،سستے سے مگر اسٹائلش انداز میں سلے ہوئے جوڑے۔وہ اپنا خیال رکھنے لگی تھی۔کتنی نکھری نکھری، ینگ اور فریش لگ رہی تھی۔نظر کی عینک کا نفیس سا فریم جس نے اس کی شخصیت میں تمکنت پیدا کر دی تھی۔

ماہا کی متحیر آںکھوں میں ستائش ابھر آئی۔تم نے کتنی جلدی خود کو سیٹ کر لیا۔

ثانیہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تم بھی کر سکتی ہو۔ابھی بھی وقت تمہارے ہاتھ میں ہے۔

ہاں۔۔۔وہ نجانے کیا سوچنے لگی۔

بائی داوے آج موڈ کس بات پر خراب ہے؟ ثانیہ نے ہلکے پھلکے لہجے میں پوچھا۔

کچھ نہیں۔۔۔اریج کا برتھ ڈے ہے اور دادی نے منع کر دیا۔

’گفٹ اور سوٹ۔۔۔ہے نا؟ ثانیہ نے پوچھا تو ماہا نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ثانیہ اسے ٹوکنا چاہتی تھی کہ دوستیاں اپنے جیسے لوگوں میں اچھی لگتی ہیں مگر جانتی تھی کی دادی اس پر تفصیل سے روشنی ڈال چکی ہوں گی۔اریج کا تعلق خاصے امیر کبیر گھرانے سے تھا۔جب بھی اس کے ہاں کوئی فنکشن ہوتا ماہا کو یونہی مصیبت پڑتی۔

سوٹ تو میتا نیوی بلیو پہن جاؤ۔کپڑا ابھی قیمتی ہے اور سلا بھی بہت اچھا ہے۔تم پر یہ رنگ سوٹ بھی بہت کرتا ہے۔باقی گفٹ۔تو میرے پرس میں پانچ سو روپے ہوں گے اس سے زیادہ میں نہیں دے سکتی۔کیونکہ می نے اپنے سارے جمع پیسے نکال کر گولڈ ٹاپس بننے کے لیئے دیئے ہیں۔ہائے وہ آجاتے تو میں ٹاپس بھی پہن کر جاتی۔ایک ہی پل میں ماہا کا موڈ ٹھیک ہو گیا۔

زیادہ پھیلنے کی ضرورت نہیں ہے ثانیہ نے اسے گھورا۔

تھینک یو ثانیہ آپی۔وہ جب اچھے موڈ میں ہوتی تھی تب ہی اسے آپی کہتی تھی اور ثانیہ نے سچ ہی کہا تھا وہ واقعی اس قابل تھی کہ کسی سے لینے کے بجائے کسی کو دے۔

ماہا رات کو کئی کریمیں سامنے رکھ کر چہرے کو رگڑ رگڑ الگاتی سوچتی رہی۔

سونیا بیٹ تمہارے امتحان کب ہو رہے ہیں؟

سونیا بیٹا جو گود میں خواتین ڈائجسٹ کا نیا شمارہ چھپائے پوری طرح منہمک تھی ہڑبڑا کر سیدھی ہوئی۔

جی ابو۔۔۔

ابو نے سوال دہرایا۔وہ سب صحن میں بیٹھے تھے۔برآمدے میں ٹی وی چل رہا تھا۔مگر کوئی

بھیا اس طرف متوجہ نہیں تھا۔امی اور دادی کونے والے چارپائی پر سرجوڑے خالہ رشیداں کا بتایا گیا نیا رشتہ ڈسکس کر رہی تھیں۔ ثانیہ برآمدے میں بیٹھی کوئی تقریر لکھ رہی تھی جو صبح اسے اپنی اسٹوڈنٹ کو دینا تھی۔حمنہ اور رباب آپی کچن میں لاہوری بریانی بنا رہی تھیں۔ثانیہ کیساتھ والی کرسی ٹانگیں سامنے کو پھیلائے علی شیر ٹی وی کی طرف متوجہ تھا۔اس کی گود میں بیٹھا عمر بار بار اس کی تھوڑی پکڑ کر اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے مختلف سوالات سے اسے زچ کر رہا تھا۔احد آج بیوقت ہی سو گیا تھا۔علی شیر کے ساتھ والی کرسی پر سونیا دونوں پاؤں سمیٹ کر کرسی پر رکھے ڈائجسٹ میں مگن تھی جب ابو نے سوال کیا۔

اگلے مہینے

مجھے لگتا ہے تمہاری انگریزی کچھ کمزور ہے۔

نہیں تو ابو۔۔۔

علی شیر اپنی مسکراہٹ چھپائے عمر پر جھک گیا۔اس کی مسکراہٹ نے سونیا کے اندر خطرے کی گھنٹی بجائی تھی۔اس نے ابو کو مطمئن کرنے کے لیئے ایڑی چوٹی کا زور لگایا۔مگر شامت تو آنی تھی۔

علیبیٹا شام میں بہن کو ایک آدھ گھنٹا پڑھا دیا کرو۔

میں تو پڑھا دوں گا ماموں مگر یہ سونیا نخرے بہت کرتی ہے۔اندر ہی اندر قہقہے لگاتے علی نے بظاہر سنجیدگی سے کہا۔سونیا کا جی چاہا اسے کرسی سمیت اٹھا کر باہر پھینک دے۔

اب نہیں کرے گی۔ابو نے رسانیت سے کہہ کر گویا بات ختم کر دی۔

احتجاج کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔وہ غصے میں علی شیر کو گھورتی رہی۔وہ مسکراہٹ دبانے کو عمر سے یونہی باتیں کرتا رہا پھر ضبط نہ ہوا تو مڑ کر پوچھا۔

خیریت۔۔۔؟بتیس کے بتیس دانت باہر تھے۔

سانیا کا جی چاہا اس کی بتیسی توڑ دے ابو کو کیسے پتہ چلا میری انگریزی کمزور ہے؟

مجھے کیا معلوم شاید انہوں نے تمہارا ٹیسٹ دیکھ لیا تھا۔

تم۔۔۔سونیا نے دانت پیسے۔جس ٹیسٹ میں اس نے بیس میں سے چار نمبر لیئے تھے۔چھپا کر بیگ میں رکھا تھا۔وہ اچانک غائب کہاں ہو گیا سونیا کو اب پتہ چلا۔

ذلیل۔۔۔لمبو۔۔۔کنکھڑکنا منہ ہی منہ میں جتنی گالیاں دے سکتی تھی دے ڈالیں۔

یہ کڑکنا کیا ہوتا ہے؟معصومیت سے دریافت کیا۔سماعتیں خاصی تیز تھیں یا وہ ہی جزبات میں اونچا بول بیٹھی تھی۔

آئینہ دیکھ لو۔۔

ماموں سے نہ پوچھ لوں۔۔۔ماموں۔

نہیں۔۔۔سونیا نے گھبرا کر اسکی آستین کھینچی۔

ہوں۔۔۔ڈسٹرب ہو کر ثانیہ نے تنبیہہ کی۔

چلو اچھی بچی اٹھ کر پانی لے کر آؤ۔علی نے رعب جمایا۔وہ مجبوراً اٹھی تھی۔

ابو ماہا کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ پھر علی شیر کو پکار کر اسے لے کر آنے کو کہا۔ وہ اسے گھر سے باہر اتنی دیر رہنے کی اجازت کبھی نہ دیتے مگر اریج اس کی بچپن کی سہیلی تھی پھر اس کا گھر بھی اسی سڑک کے آخر میں تھا۔ گھر کیا بہت خوبصورت بنگلا تھا۔ پہلے تو سفید پوش تھے مگر جب اس کے بھائی باہر گئے اور باپ نے ریٹائرمنٹ کے بعد یہاں بزنس شروع کیا تو ان کی وضع قطع پہلے سے خاصی بدل گئی تھی۔

جی ماموں۔۔۔وہ عمر کو اپنی جگہ بٹھا کر کھڑا ہو گیا تب ہی سونیا پانی لے کر آئی۔

تمہارے لیئے منگوایا تھا پی لو غصہ ٹھنڈا ہو جائے گا۔

سرگوشی کر کے وہ باہر نکل گیا۔ اریج کے گھر تک کا راستہ اس نے سونیا کی حالت کے متعلق سوچ کر محظوظ ہوتے ہوئے گزارا تھا۔ اریج کے گھر میں خاصی گہما گہمی تھی۔ لگتا تھ اپارٹی لان می ارینج کی گئی ہے۔ وہ اندر نہیں گیا تھا چوکیدار کے ہاتھ پیغام بھجوایا۔ ماہا پندرہ بیس منٹ کے بعد جھنجھلائی ہوئی باہر نکلی تھی۔

ابھی تو صرف آٹھ ہی بجے ہیں۔

ماموں نے بھیجا ہے

اتنی جلدی کیا تھی ابھی تو پارٹی شروع ہی ہوئی تھی۔ اسے سخت غصہ آ رہا تھا۔

ماموں سے کیا کہوں؟

کیا کہنا ہے۔۔۔چلو وہ کندھے اچکا کر ساتھ چل دیا۔ گھر پہنچ کر ماہا کو ابو کی وجہ سے اپنا موڈ

ٹھیک کرنا پڑا جو ممنہ سے پوچھ رہے تھے

یہ لاہوری بریانی کیا لاہور سے لینے چلی گئی ہو۔ اب لے بھی آؤ۔

کیا بات ہے سو کیوں نہیں رہیں؟ انیہ نے جھنجھلا کر کروٹ بدلی۔ جانے وہ یہاں کیا کھٹ پٹ کرتی پھر رہی تھی۔

تم سو جاؤ نا مجھے نیند نہیں آ رہی۔

پارٹی سے جلدی آ جانے کا دکھ ہو رہا ہے۔ ثانیہ کی آواز نیند سے بوجھل تھی۔ سارا دن دماغ سوزی کے بعد وہ یونہی تھک جایا کرتی تھی۔

ہاں ہے تو۔۔۔یہ کہتے ہوئے نجانے کیوں ماہا کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

ثانیہ اسکا جواب سننے سے پہلے ہی نیند کی وادی میں کھو گئی تھی۔ ماہا دونوں ہاتھ گود میں رکھے پلنگ سے نیچے پاؤں لٹکائے اسے دیکھتی رہی۔

تمہیں کسی نے بتایا ماہا تم کتنی خوبصورت ہو۔۔۔اس کا ہلتا ہوا پاؤں رک گیا۔ کسی کی نگاہوں کی تپش سے چہرہ دہک گیا۔ اس نے دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ لیئے۔

اریج اپنی اس خوبصورت سہیلی کا کہاں چھپا رکھا تھا؟

یا اللہ۔۔۔وہ گھبرا کر اٹھ کھڑی وئی۔ سامنے آئینے میں اس کا عکس جھلملا رہا تھا، نیوی بلیو سوٹ می کھلے بالوں کے ساتھ۔ چہرے پر الوہی جزبوں کی چمک وہ یک ٹک خود کو دیکھے گئی۔ وہ خود کو کسی اور کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی اور پہچان نہیں پا رہی تھی۔

ثانیہ۔۔۔اس نے سوئی ہوئی ثانیہ کو جھنجھوڑ ڈالا۔

کیا آفت آ گئی؟

کیا میں واقعی خوبصورت ہوں؟ ثانیہ کا دل چاہا کہ بالوں سے پکڑ کر اسے خوب ہی جھٹکے دے تا کہ اسکا کھسکا ہوا دماغ واپس آ جائے

صبح تک تو نہیں تھیں اب کوئی رات ورات معجزہ ہو گیا ہو تو پتہ نہیں۔اب مجھے سونے دو چڑیل مجھے صبح اسکول جانا ہے۔

اس کے سارے نرم کومل احساسات پر بارود کا گولہ آن پڑا۔کچھ لمحے اسے گھورتی رہی پھر پاؤں پٹخ کر بستر می جا گھسی۔بس اسے رونا آ رہا تھا،صبح ناشتے پر ثانیہ اسے پوچھ رہی تھی۔

رات تم نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا تھا۔

چپ رہو تم۔۔۔وہ بدلحاظی سے گویا ہوئی۔

کیوں کیا ہوا؟ رباب نے چونک کر پوچھا۔

پوچھ رہی تھی کیا میں خوبصورت ہوں۔۔۔وہ چیخ پٹخ کر باہر نکل گئی۔

یہ کیا ہے؟

سونیا ابو کی حسب ہدایت کتاب لے آئی تھی۔ جب علی شیر نے اپنے نوٹس اس کے سامنے لہرائے جس کے ہر صفحے پر ایک بڑا سا کارٹون تھا۔سونیا نے زرا جھک کر دیکھا پھر بینیز ای سے کندھے اچکا کر بولی۔

تم پینسل اسکیچ اچھا بنا لیتے ہو۔وہ بھی اپنا۔۔

جس دن تمہارا بناؤ گا اس دن روتی ہوئی دادی کی گود میں بھا گو گی۔

سوری میں میٹرک کی اسٹوڈنٹ نہیں رہی۔ وہ دونوں ہاتھ جینز کی جیبوں میں گھسائے غصے سے اسے گھورتا رہا۔

اچھا دیکھو۔۔۔وہ ایک ہاتھ اٹھا کر صلح جو لہجے میں بولی۔اب لڑائی نہیں۔۔لو پڑھاؤ۔تمہیں ہی شوق تھا نا مجھے پڑھانے کا۔

آنکھیں شرارت سے چمک رہی تھیں۔علی شیر نے کتاب اس کے ہاتھ سے کھینچی۔

علی یہ گھڑی تم نے نئی خریدی ہے۔۔۔؟ وہ ٹیبل پر پڑے گھڑے اٹھا کر دیکھنے لگی،

'تم نے میرے سارے کے سارے نوٹس خراب کر دیئے۔وہ اب بھی انہی کے غم میں مبتلا تھا۔

تو تم سے کس نے کہا تھا میرا ٹیسٹ ابو کو دکھاؤ۔۔یہ گھڑی کتنے کی آئی ہے؟

یہ رکھو یہاں۔پکڑو کتاب اور خود ہی پڑھو۔اس نے عقب سے گھڑی جھپٹی اور کتاب اس کے ہاتھ میں تھما دی۔

میں بہت سنجیدگی سے پڑھنے آئی ہوں وہ پلٹ کر احتجاجا بولی۔

لیکن اب میں سنجیدہ نہیں ہوں۔

بھاڑ میں جاؤ۔میں ابو سے کہتی ہوں۔

وہ گھر پر نہیں ہیں۔اس نے پیچھے سے ہانک لگائی۔پھر کھڑکی کھول کر جھانکنے لگا۔اس کے لبوں

پر مسکراہٹ تھی۔ جو اس وقت قہقہے میں ڈھل گئی جب سونیا کی چیخوں نے در و دیوار ہلا دیئے۔

لیس۔۔ ہاتھ پر ہاتھ مار کر وہ اندر کی طرف لپکا۔ سونیا دادی کی گود میں گھسی تھر تھر کانپ رہی تھی۔

اور دادی دل پر ہاتھ رکھے اس سے بھی زیادہ کانپ رہی تھیں

کیا ہوا؟

اس نے۔۔ دادی اس نے میری کتاب میں پلاسٹک کی چھپکلی رکھی تھی۔ وہ روہانسی ہو کر بولی۔

ارے تم سے کس نے کہا۔۔۔ سونیا بے بی گرل۔۔۔ جھوٹے الزام۔

دادی اس نے نقلی چھپکلی۔۔۔

نقلی۔ نہیں بھئی وہ تو اصلی چھپکلی تھی۔۔۔ دیکھو اب تو کہیں بھی نہیں ہے۔ دیکھو وہ سامنے دیوار پر چڑھ گئی ہے۔

اصلی۔۔۔ سونیا مکمل طور پر لڑھک گئی۔

بس بھی کرو تم تو یوں گود میں گھسی آ رہی ہو جیسے چھپکلی نہیں مگر مچھ چمٹ گیا ہو۔ دادی بمشکل اپنے دل کو سنبھال سکی تھیں۔ الٹا اسے لتاڑنے لگیں۔

آپ کبھی ماہا کو تو کچھ نہیں کہتیں۔

یہ ہنگامی عروج پر تھا کہ ماہا ریا یور رکھے وہاں چلی آئی۔

دادی۔۔۔ چھوڑ دیا فون نے تمہیں؟ دادی نے لتاڑا۔

میں ارتج کے گھر چلی جاؤں؟ وہ نظر انداز کر کے پوچھنے لگی۔

لو ابھی پرسوں تو اس کی سالگرہ سے آئی تھیں۔

پرسوں نا۔۔۔ مجھے آج جانا ہے۔

اپنی اماں سے پوچھو۔ دادی کو اس کا ضدی ہٹ دھرم لہجہ ہمیشہ ہی برا لگتا تھا۔

امی نے صاف انکار کر دیا۔ روز روز جانا اچھا نہیں لگتا۔

امی اس نے فون کر کے بلوایا ہے۔

اس کی فرینڈز آئی ہیں۔۔۔ مجھ سے ملنا چاہتی ہیں۔ وہ کہاں کی منسٹر لگی ہے جو فون کر کے بلوا رہی ہے۔ خود نہیں ملنے آ سکتی۔ ثانیہ نے غلط وقت پر انٹری دی۔

ہیں خیریت۔۔۔ کہیں تم تو منسٹر نہیں لگ گئیں۔

ثانیہ کا موڈ خاصا خوشگوار ہو رہا تھا۔ جو کم از کم اس وقت ماہا کی طبع نازک پر خاصا ناگوار گزر رہا تھا۔ میں امی سے پوچھ رہی ہوں۔

ہاں تو بیٹی تم ایسا کرو انہیں فون کر کے یہاں انوائٹ کر لو۔ میں اور ثانیہ مل کر چائے کا انتظام کر لیتے ہیں۔ رباب کی تو اپنی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ امی نے حل پیش کیا،

رہنے دیں۔۔ وہ تو اپنی سالگرہ کی تصویریں دکھانا چاہتی تھی۔ وہ مایوس سی ہو کر پلٹی۔

اچھا سنو۔۔۔ وہ پلٹی۔۔۔ چلی جوؤ۔ مگر جلدی آ جان۔ علی کو ساتھ لے جاؤ۔

تھینک یو امی۔

یہ بھی بس پاگل ہے۔ ثانیہ نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔ آدھے گھنٹے میں وہ نک سک سے تیار جا چکی

تھی۔

ماہا سارا دن فون سے چمٹی رہتی ہے۔دادی کو سخت شکایت تھی۔

ماہا ہر دوسرے دن اریج کے گھر جانے کی ضد کرنے لگی ہے۔یہ امی کی شکایت تھی۔

ہر تیسرے دن اریج بی بی چلی آ رہی ہیں مفت کی مہمان نوازی۔رباب کو چڑ تھی اریج سے۔

ماہا اب خوش رہنے لگی ہے۔یہ ثانیہ کا تجزیہ تھا۔

خوش تو وہ واقعی رہتی تھی مگر کوئی بھی اس کی خوشی کا سبب نہیں جانتا تھا۔کپڑوں کا دھیان۔ہیئر اسٹائل کا خیال۔۔اپنے بیوٹیشن کے کورس کو اب گھر میں بھی آزمانے لگی تھی۔

یہ لڑکی تو اپنے ہاتھ پاؤں مانجھتے مانجھتے ختم ہو جائے گی دادی کو قلق تھا وہ اتنی مہنگی مہنگی کریموں پر روپے ضائع کر دیتی تھی۔حتیٰ کہ جب امی نے اسے سختی سے منع کیا کہ وہ اب اریج کے گھر نہیں جائے گی ابو کو اسکا محلے میں روز روز نکلنا پسند نہیں تو وہ آسانی سے مان گئی۔

کہاں گم ہو؟ ثانیہ اوپر آئی تو وہ خاموشی سے بیٹھے ہوئے آسمان پر بادلوں کو دیکھ رہی تھی۔

میں تیرے سنگ کیسے چلوں سجنا۔۔۔تو سمندر ہے میں ساحلوں کی ہوا۔ایک جزب کے عالم میں گنگنا رہی تھی۔اسے ثانیہ کے آنے کی خبر بھی نہ ہوئی تھی۔تب ہی ثانیہ کو چونکانا پڑا۔

کہیں بھی نہیں۔۔۔بس یہیں ہوں۔وہ سیدھی ہو گئی۔موسم اچھا ہو رہا ہے نا۔

ہاں اور مجھے تو لگتا ہے تمہارے اندر کا موسم زیادہ اچھا ہو رہا ہے۔

ثانیہ نے چاکلیٹ ویفرز کے دو پیکٹ اس کی طرف بڑھائے۔

شیاد تم ٹھیک کہتی ہو۔۔۔وہ اس کے ہاتھ سے لے کر ریپر کھولنے لگی۔

اور تم خوش بھی ہو۔

ہاں۔۔۔اس نے ایمانداری سے اعتراف کیا۔

وجہ۔۔۔۔؟

ضروری ہے کسی وجہ سے خوشی ہا مرے ہاتھ آئے۔کبھی کبھی یونہی بلا وجہ بھی تو خوش ہونے کو جی چاہتا ہے۔شیاد میں بیزار رہتے رہتے تھک گئی ہوں۔

چلو اچھی بات ہے۔تمہاری سوچوں میں کچھ تو فرق آیا۔ثانیہ دیوار سے نیچے جھانکنے لگی۔

ثانیہ تمہارا محبت کے بارے میں کیا خٰلا ہے؟ ویفر کھاتے کھاتے وہ اچانک محبت پر اتر آئی۔

کچھ کاص نہیں۔کبھی اس بارے میں سوچا ہی نہیں۔وہ باہر کھیلتے ننھے بچوں کو ہاتھ ہلانے میں مصروف تھی۔

میرا جی چاہتا ہے میں محبت کروں۔

میرا تو خیال ہے تم ایم اے کر لو کسی کام بھی آئے۔یہ محبت تو نری خواری ہے۔ہم جیسوں کے بس کا روگ نہیں۔وہ اس کی طرف پلٹی۔

کیوں ہم جیسے لوگ محبت کیوں نہیں کر سکتے؟

بھئی اس لیئے۔۔۔پتہ نہیں۔میرا تو خیال ہے یہ سب کتابی باتیں ہیں۔یوں بھی اس جزبے کو زرا سنبھال کر رکھو۔ابھی سے لٹا دو گی تو میاں کو کیا دو گی۔محبت شوہر کے ساتھ ہو تو زندگی اچھی

گزرتی ہے۔کتنا صاف اور سیدھا سا فلسفہ تھا اسکا۔

لیکن محبت اپنے اختیار میں تو نہیں ہوتی۔وہ نجانے کن پیچیدگیوں میں تھی۔

میرے خیال میں تم نے سعدیہ عزیز آفریدی کا نیا افسانہ پڑھ لیا ہے۔اور بی بی نہ تو میں نے محبت کی اور نہ محبت پر پی ایچ ڈی کی۔تم جلدی سے نیچے آؤ۔پاکستا اور نیوزی لینڈ کے درمیان ہاکی کا میچ شروع ہونے والا ہے۔

ماہا بدمزہ سی ہوگئی۔

آتی ہوں اور سنو میں انگلش لینگوئج کورس میں ایڈمیشن لے رہی ہوں۔

اب یہ نئی کیا سوجھی؟

اریج لے رہی تھی میں نے سوچا کام آئے گا۔

اریج لے رہی تھی۔جو کام اریج کرے،تم پر تو وہ فرض ہو جاتا ہے۔

تو اس میں حرج کیا ہے؟

کوئی حرج نہیں،اب تم نے ٹھان لی ہے تو کسی اور کی تھوڑی سنو گی،ایم اے کر لیتیں تو۔۔

۔ثانیہ کچھ خفا سی تھی۔

ایم اے کر کے مجھے کوئی منسٹر تھوڑی لگ جانا ہے۔پیچھے پڑ جاتی ہو ایک بات کے۔

کورس کر کے لگا جوؤ گی؟

تم مجھے کورس کے پیسے دے رہی ہو یا نہیں؟

ہاں اصل مسلہ تو یہ ہے جس کے لیئے محترمہ پریشان بیٹھی ہیں۔سوچیں گے اس پر۔ابھی تو میچ دیکھنا ہے۔وہ ہاتھ ہلا کر نیچے چلی گئی۔ماہا نے پھر آسمان پر نظریں جما دیں۔

خود کو پالش کرو ماہا تم نہیں جانتیں تم کیا ہو۔ہیرے کو صرف جوہری کی نظر پرکھ سکتی ہے۔میں تمہیں اس مقام پر دیکھنا چاہتا ہوں جہاں سب تمہیں نظر اٹھا کر دیکھیں۔

ماہا نے اکیڈمی جوائن کر لی تھی۔سونیا کے ایگزامز شروع ہو گئے تھے۔وہ علی شیر سے سارے اختلافات بھلا کر مدد لے رہی تھی۔اور یہ سچ بھی تھا کہ وہ پڑھاتا بہت اچھا تھا اور اس کے بتائے ہوئے گیس کافی حد تک درست ثابت ہوتے تھے۔بس ایک اختلاف تھا جو وہ چاہتی بھی تو نہ بھلا سکتی۔وہ اب بھی روزانہ رات کو گرما گرم جلیبیاں دودھ میں بھگو کر کھاتا تھا۔اس کے بار بار کے اعتراض پر بھی امی کان دھرتیں۔

بھئی یہ نانی نواسے کا لاڈ ہے۔تمہاری دادی بھی خوش ہو جاتی ہیں کہ کوئی خاص طور پر ان کے لیئے تردد کر رہا ہے۔تمہیں اچھی لگتی ہیں تو منگوا دیا کروں گی وہی ہمیشہ والا جواب۔

مجھے اچھی نہیں لگتیں۔وہ چڑ جاتی۔اب تو اس نے کہنا ہی چھوڑ دیا تھا۔وہ جان کر اور چڑاتا۔

تھا کہتا دادی پیالہ چھپا لیں۔سونیا نامی بلی آ رہی ہے۔

کیوں چھپاؤں۔میری سب سے پیاری پوتی ہے۔آجا سونا بیٹا تو بھی کھا لے۔دادی پکارتیں۔وہ سونیا بلی سن کر ہی بدک جاتی۔

دادی جان ہم نے کبھی جلیبیاں نہیں کھائیں کیا؟ویسے بھی مجھے پسند نہیں ہی۔

بالکل ٹھیک ۔۔۔ یہ تو ہم پینڈوؤں کا شوق ہے ۔ایک بار نجانے کس جھونک میں سونیا نیا سے پینڈو کہا تھا۔تب سے اب تک وہ اسے یونہی چھیڑتا۔سونیا واک آؤٹ کر جاتی ۔

اکیڈمی سے آتی ہو تو فون سے چمٹ جاتی ہو۔تمہیں اور کوئی کام نہیں ہے ۔اٹھ کر آٹا گوندھ دو۔رباب نے لتاڑا۔

خود کرو تو بل کا مسلہ ۔۔۔آ جائے تو بھی مصیبت ۔وہ بڑبڑاتی کچن میں گھس گئی ۔

کبھی کبھی ہاتھ پاؤں ہلا لینے سے کوئی حرج نہیں ہوتا اس کی بڑبڑاہٹ رباب کے کانوں تک بھی پہنچی تھی ۔وہ آٹا نکال کر گوندھنے لگی ۔جب ثانیہ ہاتھوں میں سیاہ نگوں جڑا کڑا لے کر آ گئی

۔

ماہا یہ کہاں سے لیا ہے؟

ماہا کا رنگ ایک پل کو بدلا۔دوسرے پل وہ جھنجھلا گئی۔آپکو کہاں سے ملا۔؟

تمہارے بیگ سے پین نکالنے لگی تھی۔

اریج نے دیا ہے۔

کافی قیمتی لگتا ہے۔۔۔وہ کلائی میں پہن کر دیکھنے لگی۔

کچھ خاص نہیں کراچی میں ایسی چیزیں کافی سستی ملتی ہیں وہیں سے لائی تھی وہ۔۔۔وہ تیزی سے آٹا گوندھنے لگی۔

ایک دن کے لیئے مجھے کیوں نہیں دے دیتیں۔میرے سوٹ کے ساتھ میچ کرے گا۔

ماہا کا دل چاہا صاف انکار کر دے مگر نہیں کر سکی۔بادلنخواستہ بولی۔لے لو۔۔۔۔

(وہ تو تمہارے لیئے ڈائمنڈ کا نکلیس بھیجنا چاہتے تھے۔میں نے کہا مروائیں گے بیچاری کو۔۔۔یہ سنگاپور سے لائے ہیں)

اپنے احساس سے چھو کر مجھے صندل کر دو
میں کہ صدیوں سے ادھورا ہوں مکمل کر دو
نہ تمہیں ہوش رہی اور نہ مجھے ہوش رہے
اس قدر ٹوٹ کر چاہو، مجھے پاگل کر دو
دھوپ ہی دھوپ ہوں میں ٹوٹ کے برسو مجھ پر
اس قدر برسو میری روح میں جل تھل کر دو

اس نے بے خود سے ہو کر دونوں ہاتھوں میں چہرہ ڈھانپ لیا۔گھمبیر آواز، چاہتوں کی شدتوں سے چور لہجہ۔اسے اپنے حصار میں لینے لگا۔

کوئی اتنا بھی چاہ سکتا ہے۔آہستگی سے ہاتھ ہٹا کر اس نے نجانے کس سے پوچھا۔کھڑکی سے جھانکتی چاندنی مجسم ہونے لگی۔

ذات کا ادھورا پن کیا ہوتا ہے۔۔۔تم نہیں جانتیں ۔دشت کا مسافر ہوں اور پیاسا۔ایک عمر گزاری ہے تشنگی میں مگر پیاس نہیں مٹی۔تمہیں دیکھا۔۔مجھے لگا میرا اپنا آپ مکمل ہونے لگا ہے۔۔تمہیں چھو لوں تو یہ تشنگی مٹے۔مگر جانتا ہوں مقدس چیزوں کا میلا نہیں کیا جاتا۔

ماہا کا جی چاہا وہ باہر چاندنی اوڑھ کر گنگنائے۔ایک بیخودی کے عالم میں وہ باہر آئی۔ایک ایک سیڑھی چڑھتے ہوئے اسے لگا وہ کسی سے قریب ہو رہی ہے مگر آخری سیڑھی پر اس کے قدم تھم گئے۔وہ ایک وجود تھا۔تنہائی کی گود میں سر رکھے۔اندھیرے کی چادر اوڑھے ہولے ہولے سسکتا ہوا۔چاندنی ایک دم سے سہکتی آگ میں تبدیل ہوگئی۔وہ تھکے تھکے قدموں سے واپس مڑی۔ارتج آئی تھی اور اس کی زبان فراٹے بھر رہی تھی۔

میرے انکل ہیں بہت بڑا بزنس ہے انکا۔ماہا کو بہت پسند کرتے ہیں وہ آپ لوگوں سے ملنا چاہتے ہیں۔

ماہا کو کہاں دیکھا اس نے امی کو کیا سب کو ہی عجیب سا لگ رہا تھا۔

میری برتھ ڈے پر۔۔۔وہ فوراً بولی۔سچ بتاؤں آنٹی اتنے ہینڈسم ہیں کہ کیا بتوؤں۔وہ تو کہہ رہے تھے کہ۔

بی بی یہ انکل انکل کیا ہوتا۔۔۔تمہارا چاچا ماما کیا لگتا ہے۔کیا عمر ہوگی؟

دادی کو تو سرے سے یہ بات ہی نہ پسند آئی تھی کی جوان جہاں کنواری لڑکی کیسے پٹر پٹر رشتے کی بات کر رہی تھی۔

بھئی یہ سب ان سے پوچھ لیجیئے گا۔میں تو بس یہ بتانے آئی تھی کہ ہفتے کو وہ آ رہے ہیں۔وہ جلد ہی جان چھڑا کر چلی گئی۔سب ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔

ماہا کو بلاؤ۔امی الجھ سی گئی تھیں۔وہ آئی تو امی نے غور سے اسے دیکھا۔ناخن کھچتے ہوئے وہ ان

سے نظریں نہیں ملا رہی تھی۔آج اس نے بال بھی نہیں بنائے تھے۔

ماہا کیا ہے یہ سب؟ کون ہے یہ عفان احمد؟امی کے لہجے میں بلا کی سختی در آئی تھی۔

مجھے نہیں پتہ۔

جھوٹ مت بولو۔تم سب جانتی ہو۔

کچھ نہیں جانتی۔۔۔وہ چیخ کر بولی اور پھر اوپر بھاگ گئی۔اور اس کے چیخ اٹھنے پر ہی سب کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ سب جانتی ہے۔

یا اللہ۔امی ڈھے سی گئی تھیں۔باقی سب کو بھی سانپ سونگھ گیا۔

ہمیں یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ماہا ایسی نہیں ہے۔حمنہ زیر لب بڑبڑائی تھی۔ثانیہ نے بےبسی سے اسے دیکھا۔ماہا میں ہونے والی تبدیلیاں محسوس تو ہونے لگی تھیں مگر ابھی ادراک نہ ہوا تھا۔

یا اللہ سب جھوٹ ہو۔۔۔جو میں سوچ رہی ہوں وہ سب جھوٹ ہو۔۔۔

اس نے دل سے دعا مانگی۔

وہ عفان احمد ہیں می ان سیارتج کی برتھ ڈے پر ملی تھی۔

دونوں ہاتھ رگڑتے ہوئے مدھم سی آواز جس سے ماہا نے کہا، ثانیہ کو احساس ہو گیا کہ اس کے خدشے بے بنیاد نہیں ہیں۔

ماہا کو یقین نہیں تھا عفان احمد اتنی جلدی اسے پرپوز کر دیں گے۔چھوٹی چھوٹی ملاقاتیں۔ستائش، تحفے۔۔۔محبت بھرے جملے، پھر محبت کا اظہار۔۔۔اسے تو خبر بھی نہ ہوئی کہ وہ ساری منزلیں

طے کر گئی ۔اچھی لگتی تھی عفان احمد کی توجہ ،وارفتگی ،بے خود ہو کر دیکھنا ،انکا ٹھہرا ٹھہرا لہجہ ۔ خوبصورت ودلنشین انداز ،وجیہہ پرسنالٹی پھر پیسہ۔۔۔

لبوں پر ہاتھ رکھے ثانیہ بے یقینی سے سنتی رہی ۔اسے یقین نہ آتا تھا یہ ماہا تھی ،اس کی بہن ۔

تم ۔۔۔تم پاگل تو نہیں ہوگئی تھیں ۔۔۔اتنا کچھ ہوگیا اور تم ۔۔۔

پتہ نہیں پتہ نہیں مجھے کیا ہوگیا تھا۔شاید میں سچ مچ پاگل ہوگئی تھی ۔۔۔مجھے اچھا لگتا تھا نہیں سننا دیکھنا،ان کے پاس بیٹھنا۔

بس کرو ماہا۔اندھیرا گہرا تھا وہ ماہا کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھ سکتی تھی مگر اسے ماہا کے لہجے سے خوف آرہا تھا۔

گھر میں شدید کشیدگی تھی ۔ہر کوئی اپنی اپنی جگہ مضطرب تھا۔علی شیر کے پیپرز شروع ہوگئے تھے سووہ گھر میں ہونے والے ہنگامے سے یکسر بیخبر تھا۔مگر ماہا کی جرات بڑھتی جارہی تھی ۔سب کا سمجھانا بجھانا،ڈانٹ ڈپٹ،لعن طعن کچھ بھی کام نہ کررہا تھا۔امی کا بلڈ پریشر مسلسل ہائی رہنے لگا تھا،عزت داؤ پر لگی تھی ۔ہفتے کا خوف سب کے اعصاب پر چھا رہا تھا پھر یہ کیسے ہوتا کہ ابو کو خبر نہ ہوتی ۔دادی نے انہیں بتایا تھا اوران سب کا جی چاہا زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائیں ۔

عائشہ تم اپنی بیٹی پر نگاہ بھی نہ رکھ سکیں۔

بہت دیر کی خاموشی کے بعد انہوں نے شکوہ کناں نگاہوں سے امی کو دیکھا تھا۔وہ چہرے پر ڈوپٹہ رکھ کررو پڑیں۔

مجھے کیا معلوم تھا وہ میرے اعتبار کی اتنی بڑی سزا دے گی ۔

اسے آنے دو پھر دیکھتے ہیں ۔بہت سوچ بچار کے بعد ابو نے کہا۔ماہا اسی کو کامیابی سمجھ کر ہواؤن میں اڑنے لگی ۔

ایسا کیا جادو ہے اس میں کہ وہ سب کچھ نظر انداز کر کے ہواؤں میں اڑتی پھر رہی ہے ۔ثانیہ اکثر ہی سوچتی تھی ۔

عفان احمد اپنی لمبی سیاہ گاڑی میں آئے تھے ۔ان کی شخصیت میں واقعی کچھ ایسا تھا کہ وہ سب مرعوب ہوگئے ۔وجیہہ رسنالٹی ،نپا تلا ٹھہراؤ لیئے ہوئے لہجہ،جس می انکا تجربہ بولتا تھا۔بات کرنے کے فن سے آگاہ ،ان کی شخصیت میں چھا جانے کی صلاحیت تھی ۔اس اکا اعتراف سب نے کیا تھا مگر وہ شادی شدہ اور تین بچوں کے باپ تھے ۔عمر میں ابو سے چار پانچ سال ہی چھوٹے ہوں گے لیکن وہ ماہا کو الگ گھر میں رکھنے اور اس کے تحفظ کے لیئے کچھ بھی اس کے نام کرنے کو تیار تھے ۔

ابو نے بہت مناسب الفاظ میں ان سے معزرت کی تھی ۔عفان احمد کا روشن چہرہ تاریک ہوگیا تھا ۔وہ تو پورے یقین سے آئے تھے ۔ماہا کو سب ہی کچھ دینے کو تیار تھے مگر ابو نے کہہ دیا کہ انہیں روپے پیسے کا لالچ نہیں ،مگر ان کی بیٹی کو تو تھا ۔اسے عفان احمد سے محبت تھی یا نہیں مگر وہ اسے ایک روشن مستقبل ضرور دے رہے تھے ۔ایسا جگمگاتا ہوا مستقبل کہ اس کی آنکھیں چکاچوند ہو رہی تھیں ۔تب ہی تو وہ زخم کھائی ناگن کی طرح پھنکار رہی تھی ۔

مجھے صرف عفان احمد سے شادی کرنا ہے۔آپ انکار کریں یا اقرار مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا

تھوڑی بھی شرم ہے تجھ میں تو کہیں جا کر ڈوب مر۔امی کی مار اسکے ارادے کو اور پختہ کر دیتی، مروں گی نہیں، میری زندگی اتنی ارزاں نہیں ہے کہ یوں ضائع کر دوں۔اس کا لہجہ عجیب سے عجیب تر ہوتا جا رہا تھا۔

رباب سمجھانے لگتی۔میری طرف کیوں نہیں دیکھتی ہو۔دوسری عورت کے آنے سے کیا کیا عذاب نہیں ٹوٹے مجھ پر۔میرے بچوں پر، تم وہی عذاب کسی اور پر ڈھانے جا رہی ہو۔

:عفان کے پاس اتنا ہے کہ وہ دوسری شادی افورڈ کر سکیں کسی کے ساتھ ناانصافی نہیں ہوگی۔وہ ذہنی طور پر ہر چیز کے لیئے تیار تھی۔

پاگل ایک بٹا ہوا شخص تجھے سکون اور خوشی نہیں دے سکتا رباب تب بھی لہجے دھیما ہی رکھتی۔

بٹا ہوا شخص۔ماہا کی ہنسی تلخی لیئے اس کے تن بدن میں آگ لگاتی۔جو ہمارے گھر کے حالات ہیں اس میں کسی ایسے بھی شخص کی رفاقت نصیب نہیں ہوگی۔حمنہ آپی کو دیکھ لیں، کیا ہر رشتہ عفان احمد کی عمر کا نہیں آ رہا۔میں آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر چاندی کے بال نہیں گن سکتی۔ نہ راتوں کو چھپ چھپ کر اپنی کم نصیبی کے رونے رو سکتی ہوں۔

یہ سب کہتے ہوئے وہ حمنہ کا سفید پڑتا ہوا چہرہ نہیں دیکھتی تھی۔علی شیر امتحانوں کے بعد گاؤں جا چکا تھا، دادی اس بات پر شکر کرتی تھیں اسے ان حالات کی بنھک نہیں پڑی۔

حمنہ کو دیکھنے کچھ لوگ آ رہے تھے، گھر میں وہی مخصوص افراتفری تھی،صفائیاں، چائے کے لوازمات، کھانے کی تیاری، رباب کو احد تنگ کر رہا تھا۔ثانیہ کی دوڑیں لگی تھیں۔پہلے ایسا ہوتا تھا ماہا، حمنہ کو لے کر کمرے میں گھس جاتی۔فیشل بلیچ۔ہلکا پھلکا میک اپ۔اب وہ ڈائجسٹ ہاتھ میں لیئے دادی کے تخت پر پاؤں جھلانے میں مصروف تھی۔گاہے بگاہے نظر اٹھا کر اس افراتفری پر ڈالتی تو ایک استہزائیہ سی مسکراہٹ اس کے لبوں کا احاطہ کر لیتی۔رباب نے مچلتے ہوئے احد کو لے کر بہلانے کی کوشش بھی نہ کی تھی۔دادی نے ایک دو بار کہا بھی تاھ مگر وہ نظر انداز کر گئی۔دادی خود غصے میں اٹھ کر اس کو بہلانے لگیں۔پھر وہ کہانی اور مٹھائی کے لالچ میں بمشکل مانا تھا۔دادی اسے لے کر کمرے میں چلی گئیں۔حمنہ تکیوں کے غلاف چڑھا رہی تھی۔

حمنی بیٹی تم ویسے ہی بیٹھی ہو اٹھو شاباش کپڑے بدل لو۔

دادی نے کہا تو وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کام ختم کر کے باہر نکل گئی۔ماہا وہیں بیٹھی تھی۔ اتنے دنوں سے سب اسے نظر انداز ہی کر رہے تھے۔نجانے کیا سوچ کر وہ اس کے پاس چلی آئیں۔

ماہا آج حمنہ کا ہلکا سا میک اپ نہیں کرو گی؟

کیا فرق پڑ جائے گا اور اس سے پہلے کیا فرق پڑا ہے؟ ماہا نے ڈائجسٹ سے ںظریں اٹھا کر حمنہ کو دیکھا۔

حمنہ کا چہرہ تاریک سا ہو گیا وہ تیزی سے پلٹ کر باتھ روم میں گھس ھگئی۔

یہ لڑکی۔۔۔ثانیہ نے کچن میں دانت پیسے۔

اس وقت اسے مت چھیڑو۔۔۔اس کے اندر لحاظ،مروت سب ختم ہو چکا ہے۔رباب نے اسے کچھ بھی کہنے سے روک دیا۔

یہ ضرور کوئی تماشا کرے گی۔

وہ جتنے تماشے کر چکی ہے وہ کافی ہیں۔امی کا لہجہ تیز ہو گیا۔

جوابو کے سامنے کھڑی ہو سکتی ہے۔اس سے کچھ بھی بعید نہیں۔امی تیزی سے باہر نکلیں۔

تم اٹھو یہاں سے اوپر دفع ہو جاؤ اور جب تک مہمان نہ جائیں نیچے آنے کی ضرورت نہیں ہے۔ماہا رسالہ پٹخ کر کھڑی ہو گئی۔

مجھے بھی نشر مکرر دیکھنے کا زیدہ شوق نہیں۔وہ تیزی سے کہہ کر اوپر چڑھ گئی۔

مہمان آئے تھے،بیٹھے،کھایا پیا،اور ان کے ہر ہر انداز سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ یہی کرنے آئے ہیں۔لڑکے کی ماں نے پوچھا۔

بھئی جہیز میں ٹی وی،فریج تو دے رہے ہیں نا۔یہ تو آج کل ہو کوئی دے رہا ہے۔ویسے آج کل تو لڑکے کو موٹر سائیکل بھی دے رہے ہیں۔

ہماری بلا سے ٹریکٹر دیں پر بی بی ہم نے ایک ہی نہیں بیاہنی تین اور بھی ہیں۔ایک ہی جملے سے وہ دادی کے دل سے اتر گئے تھے،اور وہ تو صاف ہی کہتی تھیں لالچی لوگوں کے ہاں بیٹی نہیں دینی۔بھلے غریب ہوں مگر شریف ہوں۔

خاتون کا منہ اتر گیا۔امی سے کہنے لگیں آہ کی ساس تو بہت نک چڑھی ہیں۔

بس اب آگے کیا بات ہونی تھی دادی نے کھانا بھی نہیں سرو کرنے دیا۔ان کے جانے کے بعد رشتے کرنے والی کو بلا کر خوب لتے لیئے۔

خبردار اگر تم آئندہ ایسے لوگوں کو لے کر آئیں۔میں تمہیں ایک پیسہ نہیں دوں گی:۔

بی بی اب کسی کے منہ پر تو نہیں لکھا ہوتا۔وہ کھسیانی سی ہو کر بولی۔

شرافت منہ سے بولتی ہے دیکھنے والی آنکھ چاہیئے۔بس اب تم کوئی رشتہ مت لانا۔ہم نے نہیں کرنی۔یہ فقرہ وہ ہر رشتے کے ختم ہونے پر بولا کرتی تھیں۔

ماہا نے اوپر سے جھانک کر دیکھا۔رشتے کروانے والی چلی گئی تھی۔گھر میں مخصوص سی خاموشی جس میں مایوسی گھلی ملی تھی چھا گئی۔وہ نیچے آ گئی۔

ختم ہو گیا ڈرامہ؟

سب نے اسکی بات سنی مگر جواب نہیں دیا۔وہ ٹیبل پر بیٹھ کر پیسٹری کھانے لگی۔

چہ چہ۔اتنی مایوسی۔ارے بھئی کوئی نئی بات تو نہیں ہوئی۔۔سب کچھ ویسے کا ویسا ہی تھا۔۔ہاں بات طے ہو جاتی تو عجیب تھا۔اس نے ایک نظر سب پر ڈالی اور باقی ماندہ پیسٹری ختم کی۔میں تو حیران ہوں ہر بار آپ اتنے پر امید کیسے ہو جاتے ہیں۔حمنہ برتن سمیٹ رہی تھی ثانیہ نے اسکا ضبط سے سرخ ہوتا چہرہ دیکھا۔

اب تم نے مزید بکواس کی تو میں تمہارا منہ توڑ دوں گی؟

میرا منہ توڑنے سے اگر حمنہ آپی کا رشتی طے ہوجاتا ہے تو ضرور توڑ دیں۔ ماما کا اطمینا ہنوش برقرار تھا۔حمنہ کا اہتھ لرزا پلیٹ چھوٹی اوراس نے وہیں بیٹھ کر رونا شروع کردیا۔ ماما نے کرچی کرچی پلیٹ کو دیکھا۔ ماما کو خبر نہیں تھی کہ اس کی زبان ان سب کو اس پلیٹ سے زیادہ کرچی کر رہی تھی۔ وہ واقعی بیحس ہوگئی تھی۔

تو مرجاماما دفع ہوجا کہیں۔ جان چھوڑ دے ہماری۔امی کے دو تھپڑ اسکی پشت پر پڑے۔

مرنا نہیں ہے مجھے۔عفان احمد سے بیاہ دیتے تو جان چھوٹ جاتی آپکی۔مگر آپ نے بیاہنا نہیں ہے ہمیں۔ میری تو سمجھ میں نہیں آتا اتنی بیٹیوں کا کریں گی کیا۔اور میں حمنہ نہیں ہوں جو روز یوں تماشا بن کر بیٹھ جاؤں اور ویسے بھی وہ دن دور نہیں جب اس گھر میں شادی شدہ اور رنڈوؤں کے رشتے آئیں گے اور آپ خود مجبور ہوں گی۔ ہاں کرنے کے لیئے۔اسی لیئے میں نے عفان احمد سے کہا ہے کہ وہ تھوڑا سا انتظار کریں۔سفاک بے درد لہجہ۔

وہ دس سال بھی انتظار کرے تب بھی میں تمہارا ہاتھ اس کے ہاتھ میں نہ دوں۔ ہماری عزتوں کی دشمن تو پیدا ہی کیوں ہوئی۔

تب تک کا انتظار کون کرے گا۔آپ شادی نہیں کریں گی تو میں بھگا جاؤں گی مگر شادی عفان احمد ہی سے کروں گی۔

جو جہاں تھا وہیں تھم گیا۔اتنی بڑی بات کتنے سکون سے کہ گئی تھی۔

اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔

ابو کی آواز نے ان سب کو ہلا دیا۔کسی کو خبر نہیں کہ انہوں نے کچھ سنا اور دیکھا تھا۔ایک پل کو ماما بھی متوحش سی ہوگئی۔

عفان احمد سے کہو نکاح کا انتظام کرے۔

ابو۔۔۔رباب کے منہ سی چیخ نکل گئی۔

جلد از جلد اور اس کے بعد تمہارا اس گھر سے کوئی تعلق نہیں ہوگا۔تم ہمارے لیئے اور ہم تمہارے لیئے مرگئے۔اب تم میری نظروں سے دور ہوجاؤ۔ ماما کے ساکت وجود میں جنبش ہوئی اور وہ بھاگتی ہوئی اوپر چلی گئی۔

ایسا مت کرو، وہ نادان ہے سمجھ جائے گی دادی سسک اٹھی تھیں۔ باقی سب اس اچانک فیصلے سے اب تک شاکڈ تھے حتی کہ امی بھی اپنی جگہ ہل تک نہ سکی تھیں۔ ابو دادی کے تخت پر یوں گرے گویا کوئی درخت اندر سے کھوکھلا ہو کر گرتا ہے۔

میں اس بات کا انتظار کروں اماں کہ وہ میری عزت ک اجنازہ نکال دے۔مجھ میں اتنی ہمت بھی نہیں ہے کہ اس کا گلا گھونٹ کر اسی آنگن میں دفن کردوں۔وہ انگارے دامن میں بھرنا چاہتی ہے تو ٹھیک ہے، جلنا ہی اس کا مقدر ہے۔ہم سمجھ لیں گے ہماری چار ہی بیٹیاں تھیں۔

انہوں نے زندگی میں پہلی بار ابو کو روتے دیکھا تھا۔

شام اسے ہمیشہ سے بہت خوبصورت لگتی تھی۔

اسے لگتا شام اورساک کوئی بہت ہی گہرا تعلق ہے۔آسمان پر پھیلے زرد و نارنجی رنگ ہمیشہ سے

اس کے جانے بوجھے تھے، ان رنگوں کو اپنی ہتھیلیوں میں بھرنے کی خواہش ہمشہ اس کے اندر بڑی شدت سے ابھرتی تھی لیکن اب یہی شام کتنی بجھی بجھی اور بے رنگ تھی۔

اور یہ زندگی اتنی تھکی ہوئی اور بیزار۔

وہ کب سے ایک ہی زاویے پر بیٹھی کبھی ڈائجسٹ کھولتی تو کبھی بند کرتی۔ کسی کہانی نے اس کی توجہ نہیں کھینچی تھی۔ ڈائجسٹ بند کر کے اسنے دونوں ہاتھ گھٹنوں کیگرد لپیٹ لیئے۔ اور سر اٹھا کر آسمان پر سمٹے رنگ دیکھنے لگی۔

گرمیوں کا موسم رخصت ہونے کا تھا۔

ہلکی سی ہوا ویفر کے ریپر ادھر ادھر اڑانے لگی۔ عمر ابھی ابھی نیچے گیا تھا۔

یہ ہمارے ساتھ کیا کر گئی ہو ماہا۔۔۔اس نے وحشت زدہ ہو کر سوچا۔

ہر کوئی کتنا کاموش اور وحشت زدہ سا تھا ایک جامد چپ تھی جو سب کے لبوں پر جم گئی تھی۔ اتنی گہری خاموش، اتنی کاموش ی تو موت والے گھر بھی نہیں ہوتی۔ کم از کم بین کرنے، اہ و فریاد کی آوازیں تو آتی ہیں۔ یہاں تو ہر کوئی ایک دوسرے سے منہ چھپاتا پھر رہا ہے۔ نظریں چراتا تھا بات کرنے سے یوں خوفزدہ جیسے کسی جرم کا مرتکب ہو رہا ہو۔

پھول چننے کی واہش میں سارے کانٹے ہمارے لیئے کیوں چھوڑ گئی۔ سوچ در سوچ کا سلسلہ تھا

۔

کیا بچا ہمارے لیئے۔ بد اعتمادی، بے اعتباری، خوف وحشت۔ تم ین ایک بار بھی نہ سوچا تم

ہمارے ساتھ کیا کر رہی ہو۔ ابو کا مان، امی کا اعتماد سب قدموں تلے روند ڈالا۔ جاؤ ماہا جاؤ آسامن چھو لو، تم کیا جانو زمین پر رہنے والے پر کیا بیتی۔ تب ہی سیڑھیوں کی طف سے قدموں کی چاپ ابھری۔

ٹینگ پلیز۔

ٹھنڈے مشروب کا گلاس جس میں آس کیوبز تیر رہے تھے اس کے سامنے تھا۔ سونیا نے خاموشی سے گلاس تھام لیا۔ علی شیر اپنا گلاس لیئے سامنے والی چار پائی پر بیٹھا گیا۔

سونیا منتظر تھی کہ شاید وہ کچھ بولے مگر وہ خاموشی سے گھونٹ گھونٹ مشروب پیتا آسمان پر اڑتے پرندے دیکھتا رہا پھر گلاس خالی کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنا کر یونہی عقب میں لیٹ گیا۔

سونیا خاموشی سے گلاس میں جھانکتی رہی۔ اس نے ابھی تک ایک گھونٹ بھی نہ لیا تھا۔ وہ خود میں علی شیر سے آنکھ ملا کر بات کرنے کی ہمت نہ پا رہی تھی۔

عل نے نظروں کا زاویہ بدل کر سونیا کو دیکھا۔

وہ کتنی شرمندہ شرمندہ سی نظر آ رہی تھی ایک ایسی بات میں جس میں اسکا کوئی دوش ہی نہ تھا۔ کتنا خوش خوش واپس آیا تھا۔ بی اے میں شاندار کامیابی پھر یونی ورسٹی میں ایڈمیشن، ان کے خاندان میں سے اب تک کون یونیورسٹی گیا تھا، مگر یہاں۔۔۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔

یہ سوئیاں بارہ پر ہی رہیں گی۔

ہوں۔۔۔وہ چونکی۔

یہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر منہ کیوں پھلا کر بیٹھ جاتی ہو۔ بالکل سڑا ہوا بینگن لگتی ہو۔

چھوٹی بات، یہ چھوٹی بات ہے علی وہ پہلی بار اس سے الجھی نہ تھی۔ سنجیدہ سنجیدہ سی سونیا علی کو ایک دم بڑی بڑی سی لگی۔

وہ ایک دم نظریں چرا گیا۔ جو گزر گیا اس کے لیئے کیا رونا۔

یہ جو گزر گیا ہے علی یہ ہمیں اندر تک توڑ گیا ہے۔ میں کسی سے نظریں نہیں ملا سکتی۔ نہ ابو سے نہ امی سے۔

لیکن اس میں تمہارا کیا قصور؟

باہر نکلتی ہوں تو اپنا آپ مجرم سا لگتا ہے۔ ایسا لگتا ہے یہ سب ماما نے نہیں میں نے کیا ہے۔ علی ماما نے کیوں کیا ایسا۔۔۔وہ ایسی تو نہ تھی۔۔۔پھر اتنی خودغرض کیون ہوگئی۔۔۔اور کیا وہ خوش رہ سکے گی۔۔۔امی ابو کو ناخوش کرکے اس بوڑھے کے ساتھ۔ وہ ایک دم رو دی تھی۔

علی شیر کی سمجھ میں نہ آیا وہ سونیا کو کیسے خاموش کروائے۔ اس کا ہاتھ اضطراری انداز میں اس کے کندھے تک جا کر رک گیا۔ پھر اس نے ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ اسے لگا سونیا کو کھل کر رونا چاہیئے۔ بہت دیر رونے کے بعد وہ شرمندہ شرمندہ سی دوپٹے سے چہرہ صاف کرنے لگی۔

تم بھی سوچ رہے ہو گے کہ ہم۔۔

میں کچھ نہیں سوچ رہا۔ علی کے لہجے میں سختی سی در آئی تھی۔ اور بات سنو تم میری۔

اس کے لہجے میں کچھ تو ایسا تھ کہ سونیا نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

میرے لیئے تم لوگ اب بھی ویسے ہی ہو۔ ماما نے جو کچھ کیا اپنی زمہ داری پر کیا۔ وپ ہمیشہ سے اتنی ہی خودغرض تھی۔ لیکن تمہیں اس کی کسی بھی حرکت پر شرمندہ ہونے کی یا منہ چھپانے کی ضرورت نہیں۔ لوگ باتیں کرتے ہیں کرنے دو، کب تک کریں گے۔ تمہیں اپنے بارے میں سوچنا ہے اور پنے فیوچر کے بارے میں۔ آئندہ مجھے تمہاری یہ سڑے بینگن جیسی شکل نظر نہیں آنی چاہیئے۔ فوراً اٹھو ہاتھ منہ دھو کر کتابیں لے کر اوپر آؤ۔

وہ کو سر اٹھائے سنجیدگی سے بات سن رہی تھی آخری بات پر جھنجھلا گئی۔ علی تم۔۔۔

بس۔۔۔اس نے ہاتھ اٹھا کر خاموش کروا دیا۔

تم ہمیشہ سے اتنی ہی نکمی ہو۔ پڑھائی سے جان چھڑانے والی۔ اٹھ جاؤ۔

تم ہمیشہ سے میرے دشمن ہو۔ وہ پاؤں پٹختی سیڑھیوں تک گئی پھر رک کر پلٹی۔

علی وہ جو مڑ کر دیوار کے دوسری طرف دیکھنے لگا تھا پلٹا۔ تھینکس۔

وہ بس مسکرا دیا۔ (تم جانتی ہی سونیا تم میرے لیئے کیا ہو)

ماں نے کہا تھا تم کسی قابل ہو جاؤ علی شیر تو میں بھائی صاحب سے کہوں گی تمہیں اپنا بیٹا بنا لیں۔

تب پہلی بار اس نے سونیا کو مختلف انداز میں سوچا تھا تو لگا جسے تنگ کرنے کے وہ نت نئے طریقے سوچا کرتا تھا۔ نا جانے کب اپنے محبت کا بیج اس کے دل میں بو گئی تھی۔ وہ اپنے جزبو

پر خوش بھی تھا اور حیران بھی۔

وہ بلیک پینٹ اور لائننگ والی شرٹ می ملبوس بائیک کی چابی گھماتا باہر آیا۔ ابا کی فصل اچھی ہوئی تھی۔ کچھ اس کی کامیابیوں سے خوش ہو کر اسے بائیک لے دی تھی۔ تھی تو سیکنڈ ہینڈ لیکن تھی اچھی حالت میں۔ وہ پہلے بھی ماموں کی بائیک پہ سونیا کو کالج ڈراپ کر دیتا تھا۔ اب اسکا یہی خیال تھا کہ یونیورسٹی جا یت ہوئیں ونیا کو کالج چھوڑ دیا کرے گا مگر برآمدے میں بیٹھ وسونیا کو دیکھ کر ٹھٹھک گیا۔ گھریلو کپڑوں میں تھی اور ڈبل روٹی کا ٹکڑا ہاتھ میں لیئے چڑیوں کو دیکھ رہی تھی۔

تمہیں آج کالج نہی جانا؟

سونیا نے نفی می سر ہلایا اور ہاتھ میں پکڑا ٹکڑا تھوڑا تھوڑا کر کے چڑیوں کا ڈالنے لگی،

پھر وہی بات۔ علی جھنجھلا گیا۔ کب تک سوگ مناتی رہو گی؟

وہ کاموش رہی۔

میری سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ کسی اور کے کیئے کی سزا سونیا کیوں بھگتے۔ ثانیہ کچن میں بول رہی تھیاور اس کی آواز خاصی بلند تھی۔

حیرت زدہ سا علی پنجوں کے بل اس کے پاس جا بیٹھا۔ یہ کیا ہے؟

امی کا خیال ہے مجھے کالج نہیں جانا چاہیئے۔ سونیا نے سپاٹ لہجے میں بتایا۔

مگر یہ غلط ہے علی شیر نے کہنا چاہا۔ اندر یہی جملہ ثانیہ کہہ رہی تھی۔

یہ غلط ہے امی سونیا پر پابندیاں کیوں؟

کیوں اسے بھی شتر بے مہار کی طرح چھوڑ دوں تاکہ کل کو وہ بھی کسی بڈھے کو لا کر ہمارے سر پر مسلط کر دے کہ مجھے اسی سے شادی کرنی ہے۔

پھر سونیا ہی کیو میں کیوں نہیں۔ میں بھی جاب چھوڑ کر گھر بیٹھ جاؤں اور وہ بی بی ماہا تو نہ کالج جاتی تھی نہ اسکول گھر میں بیٹھی تھی پھر بھی آپکی آنکھوں میں دھول جھونک گئی۔ جنہیں کچھ کرنا ہوتا ہے وہ باہر نکلنے کا انتظار نہیں کرتیں۔

جہنم میں جاؤ تم ساری کی ساری جونکوں کی طرح میری جان کو چمٹ گئی ہیں۔ کوئی برتن ٹوٹا تھا اور امی چیخنے لگی تھیں۔

تمہارے ماں باپ تو اس قابل نہیں رہے۔۔ تم ڈھونڈو اپنے لیئے بر۔۔ اسی لیئے پڑھایا تھا اسی دن کے لیئے بڑا کیا تھا۔

ثانیہ ڈوپٹہ اوڑھتی سرخ چہرے کے ساتھ کچن سے نکلی۔ ان کے قریب سے نکل کر باہر چلی گئی تھی۔ اندر آئشہ اونچی آواز میں رو رہی تھیں۔ علی نے رخ موڑ کر سونیا کو دیکھا جس نے آنسو روکنے کی کوشش می لب بھینچ کر سرخ کر لیئے تھے۔ وہ کھڑا ہو گیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا سونیا کو تسلی دے بھی تو کن الفاظ میں۔

میں ماموں سے۔۔۔

پلیز۔۔ سونیا کھڑی ہو گئی۔ میں امی کو کوئی اور دکھ نہیں دے سکتی۔ وہ اس کے پاس سے نکل کر

اندر دادی کے پاس چلی گئی۔

دادی نے اسکا اترا ہوا چہرہ دیکھا۔

تو فکر نہ کر بچی تیری ماں ابھی غصے میں ہے، دکھی ہے۔ ماہا نے ہم سب کو ہی دکھ دیا ہے۔ ابھی کچھ دن کالج سے چھٹی کر لے پھر سب ٹھیک ہو جائے گا۔

سونیا نے اثبات میں سر ہلایا اور خاموشی سے دادی کے پاس لیٹ گئی۔ کچھ دن کے بعد ابو نے پوچھا تھا کہ وہ کالج کیوں نہی جا رہی۔ جواب میں وہ خاموش رہی تو انہوں نے علی شیر سے کہا کہ وہ سونیا کو کالج چھوڑ آیا کرے۔ اور واپسی پر بھی لے آیا کرے۔ امی نے کچھ نہیں کہا تھا مگر انہیں افسوس ضرور ہوا تھا۔ ان کے فیصلے کو کتنی آسانی سے رد کر دیا گیا تھا۔

رباب ہارون کا نمبر تو ملاؤ۔ جب سے ماہا کی شادی کی اطلاع اسے دی گئی تھی اس ن یا یک بار بھی فون نہیں کیا تھا۔ وہ انہیں دن رات یاد آ تا۔

اس وقت آفس میں ہوگا۔

وہیں ملا دو۔ انہوں نے کہا تو وہ فون ان کے قریب لے آئی۔ بہت دیر تک بیل جانے کے بعد کسی نے فون اٹھایا تھا۔ اور ہارون کا پوچھنے کے بعد جو اطلاع اسے ،لی تھی اس نے رباب کو حواس باختہ کر دیا تھا۔

میں ہارون مصطفیٰ کی بات کر رہی ہوں۔

دوسری طرف نا جانے کیا کہا گیا تھا اس نے مرے مرے قدموں سے ریسیور رکھ دیا۔

کیا ہوا؟

امی۔ وہ بہت دیر سوچتی رہی کہ کیا کہے۔ پھر جملہ پورا کیا۔ آج ہارون کی منگنی ہے سب وہیں گئے ہیں۔

نیند گویا جھونکا سا ہو کر رہ گئی تھی۔ کبھی کبھی ایک پل کے لیئے غفلت سی ہوتی اور ساری رات ذہن کی تھالی میں سوچ کے سکے ٹھن۔۔۔ ٹھن بجتے۔ ان ٹھنٹھناتی سوچوں کا سلسلہ دن کی روشنی میں بھی نہ ختم ہوتا۔ دادی تو تسبیح کے دانے گراتے گراتے آہیں بھرتی رہتیں۔ وہ کیا کرتیں، منہ سر لپیٹے کسی بت کی طرح ساکت پڑی رہتیں۔ کوئی بات کرتا تو کاٹ کھانے کو دوڑتیں۔ اس دن نا جانے دل اتنا بےچین سا کیوں تھا۔ وہ اٹھ کر بازار چل دیں۔ سردیاں آنے والی تھیں اور دادی کے لیئے گرم کپڑے لینے تھے۔

امی میں ساتھ چلوں۔ حمنہ نے کہا تھا اور شاید ان کی طبیعت کے پیش نظر کہا تھا۔

کوئی ضرورت نہیں وہ اسی پر الٹ پڑیں۔ کیسا وقت آیا تھا کہ اپنی ہی اولاد بری لگ رہی تھی۔

وہ ہارون کے رویے سے ہرٹ ہوئی ہیں۔ ان کے جانے کے بعد ثانیہ نے کہا۔

ہاں تو وہ کب تک یوں کنوارا بیٹھا رہتا دادی کو بھی تو اپنا ابل نکالنا تھا۔

ہم نے نہیں کہا تھا ہمارے لیئے بیٹھے۔ اسے ہی قربانی کی عظیم مثال بنانے کا شوق چڑھا تھا۔ ہم میں سے کس نے کہا تھا کہ وہ شادی نہ کرے۔ شادی کرتا بیوی کو ساتھ لے جاتا، ہم کیا اسے روک دیتے۔ امی ابو کب سے اسکے پیچھے پڑے تھے۔ تب ایثار کے جزبے اُمڈ رہے تھے

موصوف کے دل میں، ابھی نہیں کروں گا، بہنوں کے بعد کروں گا، اب اگر کرنا تھی تو امی ابو سے بات کرتا۔ وہ انکار کرتے کبھی نہیں لیکن وہ بھی تھرڈ لا نکلا ماہا کی طرح۔ غصے سے ثانیہ کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ منگنی کر لی ہے اب شادی بھی کر لے۔

بس بھی کرو ثانیہ بات کو بڑھاؤ نہیں۔ رباب نے عمر کو بہلاتے ہوئے اکتاہٹ سے کہا۔

اور تم بھی رباب آپی اگر آنا ہی تھا تو کم از کم بچوں کو تو اس کے پاس چھوڑ آتیں۔ موصوف کو پتہ چلتا۔ بچے صرف تمہارے ہی تو نہیں ہیں اس کے بھی ہیں۔ اس کے سر بھی تو کچھ ذمہ داری چھوڑی ہوتی۔

تمہیں کیا تکلفی ہے۔ میرے بچے بوجھ بن گئے ہیں؟ پتہ نہیں وہ سب کس کا غصہ کس پر نکال رہے تھے۔

(لڑو مرو سب یونہی ایک دوسرے کے ساتھ اور میرا دل چاہتا ہے میں خودکشی کر لوں)

حمنہ نے بے حد اکتاہٹ سے سوچا تھا،

آئشہ بیگم نے یہ سب کچھ دروازے میں کھڑے ہو کر سنا اور خاموشی سے بازار چلی آئیں۔

ٹھیک ہو تو کہتی ہے ثانیہ ہارون بھی ماہا کی طرح تھرڈ لا نکلا۔ جب ذمہ داریوں سے حالات سے گھبرا گیا تو ہاتھ چھڑانے لگا۔

دادی یک لیئے گرم سوٹ خریدتے ہوئے انہوں نے سوچا۔

میں کہاں منع کرتی تھی می تو کہتی تھی مناسب عمر ہے شادی کر لو۔

پانچ سو کے بجائے ہزار کا نوٹ تھما کر باہر نکل آئیں۔ دکاندار ایماندار تھا۔ پیچھے بھاگا۔

میں تو بہت ارمانوں سے تمہاری دلہن لاتی باقی پیسے مٹھی میں دبا کر چھوٹی چھوٹی چیزیں خریدنے لگیں۔ بعض چیزوں کے متعلق انہیں خبر بھی نہ تھی کہ وہ خرید چکی ہیں اور کیوں ضرورت تو نہ تھی پانچ سو کا نوٹ یونہی ضائع کر دیا۔

بھلے تمہاری پسند کی ہوتی ہمیں شامل تو کرتے۔ میں اپنے ہاتھ سے انگوٹھی پہناتی۔

سڑک کے کنارے ننھے بچوں کی رطح سوچیں ان کے ذہن میں آنکھ مچولی کھیل رہی تھیں اور انہیں سمجھ نہی آ رہا تھا کہ کہاں جانا ہے۔ ان کی نظروں کے سامین بہت سی گاڑیاں، رکشے۔ موٹر سائکلیں۔ ٹیکسیاں سرعت سے گزرتی جا رہی تھیں اور خالی الزہنی کے ساتھ یہ سب دیکھ رہی تھھیں پھر انکا دل دھک سے رہ گیا۔ اندر کہیں ڈوبا تو ابھرنے کا نام نہیں لیا۔ کسی گزرتے لمحے کی سی تیزی کے ساتھ گزرنے والی گاڑی میں کوئی اور نہیں ماہا تھا۔ ماہا نے انہیں نہیں دیکھا تھا۔ مگر انہوں نے پوری طرح دیکھا تھا۔ اسٹیئر نگ پر مضبوطی سے ہاتھ جمائے بالوں کی کٹنگ اور سن گلاسز کے باوجود ان کا دل دھڑک دھڑک کر کہہ رہا تھا کہ وہ ماہا تھی۔

ن کی ٹانگیں لرزیں، جسم بیجان ہو گیا اور وہیں تقریباً گرتے ہوئیانہوں نے دنوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام لیا۔ شاپنگ بیگز بکھر گئے تھیاور دل دھڑ دھڑک کر ماہا۔۔ ماہا پکار رہا تھا۔

آپ ٹھیک تو ہیں؟ ناجانے کس نے پوچھا تھا۔ انہوں نے بہت دور ٹریفک کے ہجوم پر نظر دوڑائی اور بدقت اثبات میں سر ہلایا۔

ماہا۔ایک سسکی سی بندلبوں تک آ کرٹوٹ گئی تھی۔ہمیں دکھ دینے والی اللہ تیرا بھلا کرے

ہمیں بربادکرنے والی اللہ تجھے آبادرکھے

ہمیں بدنامی کے اندھیروں میں دھکیلنے والی اللہ تجھے سکھی رکھے۔

آنسوایک تواتر سے ان کے گال پر پھسل رہے تھے۔دل دہائیاں دے رہا تھا۔کپکپاتے ہاتھ چیزیں چن چن کرلفافے میں ڈال رہے تھے۔

تب ہی کسی نیا نہیں جھنجھوڑ ڈالا۔آئشہ۔۔۔آئشہ وہ خالی خالی نظروں سے دیکھنے لگیں۔

عائشہ ہوش کرو۔یہ میں ہوں قدسیہ۔کیا ہوا تمہیں۔میں سڑک پار سے تمہیں دیکھ کرآئی ہوں۔

تب ہی وہ گویا حواسوں میں آئیں۔ہاں یہ سفید چکن کا دوپٹہ اوڑھے صحت مندسی عورت جوان پر جھکی تھی۔قدسیہ تھی،انکی دور پرے کی کزن۔برسوں ہوگئے تھے ملے ہوئے۔ایک شہر میں رہتے ہوئے بھی ملنا ملانا نہیں ہوتا تھا۔

تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگتی آؤ تمہیں گھر چھوڑ دوں۔

میں ٹھیک ہوں۔انہوں نے کھڑے ہونے کی کوشش کی لیکن ٹانگیں وجود کا بوجھ اٹھانے سے قاصر تھیں تب ہی ایک سفید گاڑی عین ان کے سامنے آرکی۔

خیریت امی۔بھاری سنجیدہ آواز ان کے سرپر گونجی۔

بیٹا تمہاری خالہ کی طبیعت ٹھیک نہیں انہیں گھر چھوڑنا ہے۔

آئیں خالہ کسی کے مضبوط بازوؤں نے سہارا دے کر کھڑا کیا تھا،انہی ہارون یاد آیا تھا گاڑی

میں وہ خاموش ہی رہی تھیں۔ان کی حالت کے پیش نظر قدسیہ بھی خاموش تھیں۔گھر آنے تک عائشہ خودکوسنبھال چکی تھیں بصداصرارانہیں اندر لے گئیں۔

علی شیر گھر میں تھا وہ ان کے بیٹے جوادکو بیٹھک میں لے گیا۔حمنہ چائے کے ساتھ کباب اور آلو کی قتلیاں تل لائی تھی۔

رباب کے متعلق انوں نے کچھ چھپانے کی کوشش نہیں کی تھی سارے خاندان کو پتہ تھا۔ماہا کے متعلق بس یہی بتایا تھا کہ اس کیش ادی کردی اور آج کل بڑی سے پہلے چھوٹی کی شادی ہوجانا اتنا عام ہو چکا تھا کہ کہ اگرانہیں کچھ معلوم تھا بھی تو انہوں نے تبصرہ نہیں کیا۔ان سب کو قدسیہ آنٹی اچھی لگیں۔پڑھی لکھی،مہزب،گفتگومی سلیقہ۔اپنی بہو کے متعلق بغیر کوئی برائی کیئے بس یہی بتایا کہ بیٹے کے ساتھ مزاج نہیں ملا اس لیئے علیحدہ ہوگئی۔بچہ کوئی تھا نہیں،جوان کے پیروں کی زنجیر بنتا۔ہوتے ہوتے گفتگو کا رخ اچھے رشتوں کے کال کی طرف چلا گیا تو لڑکیاں بدمزہ ہوکراٹھ گئیں۔جاتے ہوئے دادی ان کے کان میں اگرتمہاری نظر میں کوئی اچھا رشتہ ہوتو حمنہ کے لیئے ضرور بتانا کہنا نہیں بھولیں تھیں۔

احد بہت دنوں سے سست ہو رہا تھا۔پھراچانک بکار کی لپیٹ میں آ گیا۔علی شیر کے ساتھ وہ ڈاکٹر کے پاس ہوآئی تھی۔انکارتو علی نے پہلے بھی کبھی نہیں کیا تھا مگر جب سے بائیک آئی تھی بہت کوئیک ہوگیا تھا۔عمر کوشاید امی نے نہلایا تھا۔وہ چارپائی ہرسب سے خفا اوندھا لیٹا ہوا تھا۔نہانے کا ایسا ہی چور تھا۔علی شیر نے اسے چاکلیٹ دے کر بہلایا۔پرکندھے پر بٹھا کراوپر چلا

گیا جہاں ثانیہ آنگن پڑھ رہی تھی اور سونیا کالج کا کام کر رہی تھی۔ حمنہ رات کے کھانے کی تیاری میں مصروف تھی۔ رباب نے احد کو دوائی کھلائی تو وہ کچھ دیر رونے کے بعد سو گیا۔ رباب بھی اس کے پاس ہی لیٹ گئی۔ نیلے آسمان پر پرندوں کی ڈاریں گزر رہی تھیں۔ سرمئی شام کے پس منظر کے ساتھ یہ نظارہ ہمیشہ ہی رباب کو پسند رہا تھا۔ وہ خاموشی سے انہیں دیکھتی رہی۔

سب پرندے دن بھر کی مسافت کے بعد اپنے آشیاں کی طرف لپک رہے تھے۔

کبھی گھر لوٹتے وقت تمہیں میرا خیال بھی آیا ہوگا احمر

ااج بہت رونا آ رہا تھا۔ احد کا ننھا سا گرم ہاتھ اپنے لبوں پر رکھ کر وہ رونے لگی۔ شام گہری ہونے لگی تھی سب اس کے پاس سے گزر کر اندر جا رہے تھے۔ اس نے بازو آنکھوں پر رکھ لیا۔ سب سمجھ رہے تھے رات بھر کی جاگی اب سوئی ہے۔ ٹی وی چلنے لگا تھا۔ برتن کھڑکھڑانے لگے تھے۔ فون کی بیل بج رہی تھی پھر حمنہ نے اسکا بازو ہلایا۔

تمہارا فون ہے۔

کون ہے؟

تمہاری نند۔

طبیعت تو ٹھیک ہے نا وہ اس کی آواز کے بوجھل پن کو محسوس کر کے پوچھنے لگیں۔

جی۔

وہ اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگیں۔ اپنے کالج کی بچوں کی وغیرہ وغیرہ۔

رباب ایک بات کہوں تم سے۔ اپنی بات اچانک ہی ادھوری چھوڑ کر انہوں نے کہا تھا۔

کہیئے۔ وہ ان کے لہجے پر ٹھٹکی۔

میرا بھائی نادان تھا، تمہاری قدر نہیں کر سکا۔ میں مانتی ہوں وہ قصوروار تھا لیکن اگر۔۔۔ اگر وہ تمہاری طرف لوٹ کر آیا تو تم اسے معاف کر دو گی؟

(معاف کر دوں۔ اپنے قاتل کو)

چھوڑیں ایسا جنہیں لوٹنا ہی نہیں ان کے متعلق بات کرنے کا فائدہ۔ اس نے حتی الامکان اپنے لہجے کو نارمل رکھنے کی کوشش کی۔

رباب دوسری طرف سے احمر کی آواز ابھری۔

یا اللہ۔ اس کا دل ڈوب گیا۔ کتنے عرصے کے بعد اس نے پکارا تھا۔

رباب میری بات سنو وہی آواز، وہی گھمبیر لہجہ مگر ٹوٹا ہوا۔

مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنا اس نے ریسیور پٹخ دیا۔ وہ بھول گئی تھی کہ ابھی کچھ دیر قبل وہ اسی شخص کو یاد کر کر کے رو رہی تھی۔ غصہ اس کے تمام جزبوں پر غالب آ گیا تھا۔

اس نے کسی سے بھی زکر نہیں کیا تھا مگر وہ خود دن رات الجھتی رہتی۔

اب خیال آیا ہے اسے میرا اور میں کیا اتنی بیوقعت ہوں کہ جب چاہے گو مجھے دھتکار دے گا اور جب چاہے گا پکار لے گا۔ اب کیا اس سے جی بھر گیا اور میں اکیلی تو نہیں ہوں میرے بچے ہیں میرے پاس۔

اپنی ہی سچوں میں الجھے الجھے وہ تھک سی گئی تھی۔

تب ہی اس دن ماہا چلی آئی۔ لمبی سی گاڑی ان کے دروازے کے سامنے رکی تھی۔ علی شیر جا بھر کھڑا کسی دوست سے بات کر رہا تھا۔ ماہا کو اترتے دیکھ کر دوست کا ہاتھ پکڑ کر سڑک کراس کر گیا تھا۔ ماہا نے محسوس تو کیا مگر وہ خود اس وقت پزل سی تھی۔ عفان احمد نے اسے جب پہلی بار نوٹوں کی گڈی دی تھی کہ وہ شاپنگ کر لے تو ان نوٹون کو ہاتھ میں لے کر وہس وچتی رہی کہ وہ کیا خریدے گی۔ وہ ارتج کو ساتھ لے کر گئی تھی۔ تب احساس ہوا تھا کہ شاپنگ کرنا کسے کہتے ہیں۔ پھر ناردرن ایریا میں مہینہ بھر ہنی مون منا کر واپس لوٹے تو ماہا سرتاپا بدل چکی تھی۔ یہاں آتے ہی عفان احمد تو مصروف ہو گئے۔ لیکن اسے ایک گاڑی خرید دی تھی اور ماہا نے بہت جلد ڈرائیونگ سیکھ لی تھی۔ آج وہ ان سب کے لیئے وہ سارے گفٹس لے کر آئی تھی جو اس نے ہنی مون کے دوران خریدے تھے۔ ملازم ڈھیر سارے پیکٹ اٹھائے اس کے ساتھ تھا۔ وہ انہیں دکھانا چاہتی تھی کہ اسکا فیصلہ غلط نہ تھا۔

سب صحن ہی میں موجود تھے۔ ایک دم وہ سب کی نظروں کے حصار میں آئی تھی۔ جدید تراش خراش کے مہنگے بوتیک کے سوٹ میں ڈائمنڈ جیولری کے ساتھ خوبصورت ہیئر اسٹائیل۔ ایک پل کو ان سب کو وہم سا ہوا کہ وہ ماہا نہیں کوئی اور ہے۔

السلام علیکم

ماہا کو ایک دم اپنا آپ ان سب سے بہت اونچا اور اہم لگا۔

آس ونراس میں ڈوبتی ابھرتی رباب۔

اپنی آنکھوں میں بجھتے خوابوں کی راکھ لیئے حمنہ۔

چار پانچ ہزار کما کر خود کو اہم سمجھنے والی ثانیہ۔

اور سستے سے کپڑے میں ملبوس کتابیں سنبھالے سونیا۔

ماہا نے اپنی کلائی میں ہیرے جڑا کنگن گھمایا۔ اپنے قیمتی لباس سے غیر مرئی شکنی دور کیں اور ملازم کو اشارہ کیا جس نے وہ رنگ برنگ پیکٹ دادی کے پاس تکت پر ڈھیر کر دیئے۔ اس کے دوسرے اشارے پر وہ گھر سے باہر تھا،

آہ لوگ مجھے دیکھ کر اتنے حیران کیوں ہیں؟

وہ کہتے ہوئے امی کی طرف پلٹی جو کمرے سے باہر آ رہی تھیں اور اسے دیکھ کر برآمدے ہی میں رک گ ءتھیں۔ ماں کو دیکھ کر ماہا کے دل کو کچھ ہوا،

امی ملیں گی نہیں؟

کیوں آئی ہو؟

میں آپ سے ملنے۔۔۔

ہم نے کہا تھا نا مت آنا۔

اتنا کٹھور تو مت بنیں آپ لوگ۔

دادی جو بہت حیرت اور تجسس سے اسکے زیور دیکھ رہی تھیں ایک دم پینترا بدل کر بولیں۔

’میں تو تمہاری ڈھٹائی پر حیران ہوں لڑکی باپ کے سر پر خاک ڈلوا کر کس ڈھٹائی سے چلی آئی ہو۔

دادی میں گھر سے بھاگ کر نہیں گئی تھی۔اا پ نے بیاہا ہے مجھے وہ تنک کر بولی۔

جس طرح تمہیں بیاہ گیا وہ بھی کچھ اتنا باعث عزت تو نہ تھا۔رباب کا لہجہ تیز ہوا،

ماہا کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

میں بحث نہیں کرنا چاہتی۔ وہ فیصلہ غلط تھا یا صحیح بہر حال میرا اپنا تھا اور میں اس پر بہت خوش ہوں۔اور بہت خوشی خوشی تم لوگوں سے لنے آئی ہوں۔میری خوشی یوں غارت مت کریں۔

سونیا ادھر آؤ دیکھو میں تمہارے لیئے کیا لائی ہوں۔

کوئی ضرورت نہیں جو عنایت تم ہم پر آل ریڈی کر گئی ہو وہ بہت کافی ہے ہمارے لیئے۔ثانیہ نے سونیا کا ہتھ پکڑ لیا حالانکہ وہ اپنی جگہ سے ہلی بھی نہ تھی۔

اور تم جاؤ یہاں سے اس سے پہلے کہ ابو آ جائیں۔ ہم نے دیکھ لیئے تمہاری عمارت کے مظاہرے اور یہ بھی کہ تم بہت خوش ہو۔

تم۔۔۔تم جلتی ہو مجھ سے ثانیہ۔ماہا کو تاؤ ہی تو آ گیا۔تم جو جاب کر کے سمجھ رہی تھیں کہ بہت معرکہ مار لیا۔چند ہزار ہاتھ میں لے کر سمجھتی تھیں،دنیا ہاتھ میں آ گئی ہے۔مجھ دیکھو۔کیا نہیں ہے میرے پاس۔گاڑی،بنگلہ۔پیسہ۔زیور۔۔۔اب میں اس قابل ہوں کہ جس ک چاہوں ضرورت پوری کر دوں۔میں مسز ماہا عفان۔۔۔

تم۔۔۔امی کے ساکت وجود میں جنبش ہوئی۔وہ تیر کی طرح آگے آئیں۔اسے بازو سے پکڑ کر دیوڑھی کی طرف دھکا دیا۔

تم دفع ہو جاؤ۔آئندہ اپنی صورت مت دکھانا۔میں سمجھ لوں گی میں نے تمہیں جنم ہی نہیں دیا۔ تم نے ہمیں کہیں کا نہیں چھوڑا ماہا اور اس پر تم شرمندہ بھی نہیں ہو۔اس بوڑھے چار بچوں کے باپ سے تعلق تمہارے لیئے باعث فخر ہوگا۔ہمارے لیئے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔۔اور یہ۔ ۔یہ اپنی عنایتیں بھی لے جاؤ۔

اس کے سارے تحفے ایک ایک کر کے دیوڑھی میں گرے تھے۔احساس توہین سے ماہا کا سارا وجود جل اٹھا۔

ان کی طرح بوڑھی روح بن جاتی میں بھی۔۔یہی چاہتی تھیں نا آپ۔۔یہ۔۔جنہیں کوئی بوڑھا بھی قبول نہیں کرتا۔وہ پھنکارتے ہوئے اپنا زہر انڈیل کر باہر چلی گئی تھی۔

کاش۔۔۔کاش تو مر ہی جاتی ماہا مجھے صبر تو آ جاتا

ان کی آہ وزاری سے قطع نظر حمنہ سب سے کٹ کر سوچ رہی تھی۔شاید وہ ٹھیک ہی کہتی ہے۔ کون آئے گا یہاں۔

قدسیہ خالہ نے گھر پر میلا در کھا تھا۔رباب کبھی نہ آتی لیکن ایک تو خود قدسیہ خالہ کہنے آئی تھیں۔ دوسرے ماہا کے آنے سے پورا گھر پھر سے ڈسٹرب ہو گیا تھا۔وہ جاتے ہوئے جو کچھ کہہ کر گئی تھی وہ خنجر کی طرح بار بار سب کو زخم دیتا تھا۔پھر اس دن آنے والا احمر کا فون۔رباب بے حد

مضطرب تھی۔ امی میلاد پر جانے کو تیار نہ ہوئیں تو وہ بچوں کا گرھ پر چھوڑ کر دادی یک ساتھ چلی آئی۔

قدسیہ خالہ بے حد خفا ہوئیں آ کر وہ سب ساتھ کیوں نہیں آئیں۔

امی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی باقی سب بھی مصروف تھیں۔ اس نے جواب دیا۔

اسی لیئے تو میں نے چھٹی کے دن شام کو میلاد رکھا تھا کہ کسی کو آنے میں دقت نہ ہو۔ کم از کم حمنہ کو ہی ساتھ لے آتیں۔ مجھے تو لگتا ہے وہ بالکل ہی گھر سے نہیں نکلتی۔ کم از کم میں نے آج کے دور میں اتنی خاموش طبع، سلیقہ شعار اور متحمل مزاج بچیاں کم ہی دیکھی ہیں۔ وہ اپنی کسی رشتے دار خاتون سے مخاطب تھیں۔

کمال ہے یہ خصوصیات آج تک کسی اور کو نظر نہیں آئیں۔ رباب نے تلخی سے سوچا۔ وہ خاتون خاصی دلچسپی لے رہی تھیں۔

انکا بیٹا کمپیوٹر انجینئیر ہے۔ آج کل لڑکیاں ڈھونڈ رہی ہیں۔ اسی لیئے تو میں چاہ رہی تھی کہ حمنہ آ جاتی۔ میلاد کے بعد خالہ نے بتایا۔

رباب کو افسوس ہوا۔ ہوستا ہے حمنہ کی قسمت کھل جاتی۔

بہر حال میں کسی دن انہیں لے کر تمہارے گھر آؤں گی۔ آمنے سے پہلے فون کر دوں گی۔

رباب نے گھر آ کر امی کو بتایا، وہ کمپیوٹر انجینئر کی ماں حمنہ کو پسند کرے گی۔

انہوں نے سپاٹ سے لہجے میں پوچھا تھا۔ قسمت کا کیا پتہ۔ وہ نظریں چرا کر اٹھ گئی۔

سردیاں شروع ہو گئی تھیں۔ صبح کو پودوں اور امرود کے درخت پر کہر جما ہوتا۔

:یہ سوکھی سردی بھی مانو جی کا جنجال ہے۔ بارش نا جانے کب ہو گی۔

علی شیر رات کو کوئلے دہکا کر دادی کے کمرے میں رکھ دیتا۔ وہ لحاف میں گٹھری سی بنی دونوں ہاتھ باہر نکالے آگ تاپا کرتیں۔ گیس کے ہیٹر سے انہیں الرجی تھی،

گیس کی بو سر کو چڑھتی ہے۔

اور کوئلوں کی سونیا ناک چڑھاتی۔

رات ک وعلی شیر جلیبیاں لے آتا۔ نانی نواسی دودھ میں بھگو کر کھاتے۔

سونیا پہلی کی طرح چڑتی نہیں تھی۔

پھوپھو نے اس بار مونگ پھلی نہیں بھجوائی تھی۔ فصل اچھی نہیں ہوئی تھی۔ البتہ شکر قندی اور دیسی گھی ضرور بھجوایا تھا۔

اپنے تمام تر غصے کے باوجود رباب کی تمام تر حسیات فون کی طرف متوجہ رہتیں مگر اس کے بعد کوئی فون نہیں آیا۔

میں کبھی اسے معاف نہیں کروں گی۔ وہ دل ہی دل میں عہد کرتی مگر عمر اب بڑا ہوتا جا رہا تھا اس کے سوال رباب کو پریشان کر دیتے۔

پاپا کہاں ہیں؟ آتے کیوں نہیں؟

یم نانا کے ساتھ کیوں رہتے ہیں؟

اور ایک دن پوچھنے لگا۔کیا ہمارے پاپا مر گئے ہیں؟

رباب کا جی چاہا کہہ دے ہاں

مگر نجانے کیوں اس نے زناٹے دار تھپڑ اس کے کومل گال پر دے مارا۔ایک پل کو حیرت اسکی معصوم آنکھوں میں منجمد ہوئی اور جب یہ جمود ٹوٹا تو اس نے رو رو کر پورا گھر ہلا دیا۔سب نے ہی رباب کو لتاڑا۔وہ احد کو امی کی گود میں پٹخ کر اپنے کمرے میں جا گھسی اور شام تک نہ نکلی۔

عمر کو علی شیر نے بہلا لیا تھا۔احد نانی کی گود میں امی۔۔۔امی کی ضد کرتا رہا۔

پتہ نہیں اس گھر کا کیا بنے گا۔ثانیہ اتنا تپی ہوئی تھی کی ہارون کا فون آیا تو اسی پر برس پڑی۔دو سال بڑا تھا وہ اس سے مگر اس نے کوئی لحاظ نہیں کیا۔وہ بے بھاؤ کی سنائیں کہ وہ اگلے دن چھٹی لے کر بھاگا چلا آیا۔ابو نارمل ہے ملے تھے۔دادی نے اچھی خاصی سنائیں۔امی کترائی کترائی سی پھرتی رہیں۔وہ روت کو ان کے بستر میں گھس گیا۔ہاتھ پاؤں جوڑے معافی منا گی۔ٹانگیں دبانے لگا۔

تم نے مجھے بہت دکھ دیا ہارون اب تو کسی پر بھی اعتبار نہیں رہا۔ہم تمہارے دشمن تو نہ تھے وہ رونے لگی تھیں۔

خدا کی قسم امی وہ بات نہیں ہے جو آپ سمجھ رہی ہیں۔حالات ہی کچھ ایسے تھے۔

اس کی بات تو سن لو۔کبھی کبھی ان سب کو ابو کے تحمل پر حیرت ہوتی تھی۔ایسے وقت میں جب سب ایک دوسرے کو الزام دینے اور لڑنے مرنے پر تلے تھے وہ کس طرح خود کو سنبھالے

ہوئے تھے۔ایک پرسکون سمندر کی طرح خاموش۔

سبرینہ ہارون کے کولیگ کی بیٹی تھی۔ہارون ان ہی کے ہاں پے انگ گیسٹ کے طور پر رہتا تھا۔دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے مگر نہ تو ہارون کے حالات ایسے تھے کہ وہ شادی کرتا اور نہ سبرینہ کے۔دونوں کسی اچھے وقت کے انتظار میں تھے کہ سبرینہ کے والد کی طبیعت خراب ہو گئی۔وہ چاہتے تھے کہ ہارون اپنے گھر والوں کو بلا لے تاکہ باقائدہ منگنی ہو سکے۔ادھر گھر میں ماہا کی شادی کے بعد حالات ایسے نہ تھے کہ وہ بات کر سکتا۔اس ین اپنے طور پر ان لوگوں کی تسلی کے لیئے ہاں کر دی۔انہوں نے مٹھائی منگوا کر پورے آفس میں تقسیم کروا دی۔

مجھ سے واقعی غلطی ہوئی مجھے آپ لوگوں سے بات کرنا چاہیئے تھی مگر ماہا والے فیصلے کے بعد اتنا ڈسٹرب تھا کہ گھر آنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔

تم نے یہ بھی نہیں سوچا کہ ہم پر کیا گزر رہی ہوگی۔امی پھر سے رونے لگی تھیں۔

بس کرو عائشہ ہم جائیں گے سبرینہ اور ان کے گھر والوں سے ملنے اور جلد ہی تمہاری شادی کر دیں گے۔

ابو بھی۔۔۔ہارون نے کچھ کہنا چاہا مگر انہوں نے ہاتھ اٹھا کر خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

:ہاں بھائی کیا پتہ بھابھی کے ابو کی طبیعت پھر سے خراب ہو جائے اور تم یونہی چھپکے سے شادی رچا کر ہمیں فون کھڑکا دو۔ثانیہ نے شریر سے لہجے میں کہا تو وہ ابو کے سامنے بس اسے گھور کر رہ گیا۔

قدسیہ خالہ کا فون آیا تھا وہ جمعہ کو ان خاتون کے ساتھ آ رہی تھیں۔ انہوں نے تمام ضروری معلومت پہلے ہی ابو اور امی کو پہنچا دی تھیں۔ رشتہ واقعی بہت اچھا تھا ع؛یشیر تو باہر سے انکا گھر بھی دیکھ آیا تھا۔ بہت پیاری کوٹھی ہے۔تو پھر وہ یہاں کیا کرنے آ رہی ہیں

حمنہ نے چپکے سے سوچا۔اس کا رویہ اب کسی بھی پروپوزل کے آنے پر عجیب سا ہوتا تھا۔ایک دم چپ اور لاتعلق۔اتنی کی کسی کو اس سے کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوتی۔شاید وہ اس سارے عمل سے تھک گئی تھی۔۔رباب اور ثانیہ نے ملکر سارا گھر صاف کیا۔قدسیہ خالہ نے زیادہ اہتمام سے منع کیا تھا۔

رشتہ طے ہو گیا تو جو مرضی کرتے رہیے گا۔

رباب نے کباب اور سینڈوچ گھر میں بنائے تھے۔کیک باہر سے منگوا لیا۔خود ہو لوگ بھی اہتمام کر کر کے اکتا چکے تھے۔وہ خاتون خاصی ہنس مکھ تھیں۔ادھر ادھر کی باتی کرتی رہیں۔

حمنہ اور ثانیہ کو غور سے دیکھا۔سلیقے سے چائے پی۔رباب کو حمنہ پر غصہ آ رہا تھا۔کس قدر سپاٹ چہرہ لیئے بیٹھی تھی۔ہر بات کتنی مختصر ترین جواب۔بس ہوں ہاں۔اس کی نسبت ثانیہ کتنی فریش لگ رہی تھی۔ہنستی مسکراتی چائے سرو کرتی۔

کیا فرق پڑتا ہے اگر ثانیہ کی ہو جائے تو۔اس نے آخر میں سوچا۔وہ چلی گئیں تو یہ لوگ قیاس آرائیاں کرتی رہیں۔ان کے رویے سے کچھ بھی تو ظاہر نہیں ہوا تھا۔بالکل نارم سا رویہ۔

کچھ دن بعد قدسیہ خالہ نے فون کر کے معزرت کر لی تھی۔ان خاتون نے اپنے بیٹے کا رشتہ کہیں

اور کر دیا تھا۔

زندگی کا کھیل جاری و ساری تھا وہ لاکھ ہاتھ پاؤں ماریں، چیخیں چلائیں، و یک دوسرے سے لڑیں۔ وقت تو اپنا کام کرتا ہی ہے۔ دن ایک کے بعد ایک ماضی کی گھپا میں گم ہوتے گئے۔انہیں لگتا کچھ بھی نہیں بدلے گا۔موسم بدلے گا مگر زیست پر وہی رنگ چھایا رہے گا۔

ناامیدی کا رنگ۔

بیقینی کا رنگ۔

مایوسی و اداسی کا رنگ۔

یہ خزاں گزیدہ موسم جیسی زیست۔

کس کا جی چاہتا تھا جینے کو مگر وہ جیتے جا رہے تھے۔ایک دوسرے پر ظاہر کرتے تھے کہ اب وہ ایسے ہی خوش ہیں۔اب نہ کوئ طلب ہے نہ خواہش۔

ماہا کیسی ہے؟ کہاں ہے؟ انہوں نے سوچنا چھوڑ دیا تھا۔

اسے گئے ہوئے کتنے دن ہو گئے ہیں؟ کتنے مہینے گزرے ہیں یا پورا سال؟ انہوں نے گننا چھوڑ دیا تھا۔

ماضی کیا تھا؟ حال کیا ہے؟ مستقبل میں کیا ہوگا؟

بیکار تھا یہ سب سوچنا۔بس رات سے دن کرنا تھا اور دن سے رات ہو رہی تھی۔

وہ اکتوبر کے عام دنوں جیسا ہی ایک دن تھا۔دھوپ بھرا، کھلا دن۔

ان میں سے کوئی بھی نہیں سوچ سکتا تھا کہ یہ دن اپنے دامن میں ان کے لیئے کچھ خاص لا رہا ہے۔حسب معمول سونیا کالج گئی تھی، چند مہینے تھے پھر اسے بھی کالج سے فارغ ہو جانا تھا۔علی شیر کے فائنل ایے کے ایگزامز زیادہ دور نہ تھے۔وہ بھی بہت مصروف تھا۔ثانیہ اسکول گئی تھی۔عمر بھئی اسکول میں تھا۔احد کو رباب نے نہلایا تھا۔وی دادی کی گود میں بیٹھا غور سے کہانی سن رہا تھا۔رباب سرسوں کا تیل لیئے ماں کے پاس بیٹھی تھی تا کہ ان کے سر کی مالش کر سکے۔حمنہ نے واشنگ مشین لگا رکھی تھی جب قدسیہ خالہ آ گئیں۔

انکا آنا کچھ ایسے اچنبے کی بات نہیں تھی۔وہ اکثر آ جایا کرتی تھیں۔

السلام علیکم۔آج انکی آواز معمول سے زیادہ بشاش اور چہکتی ہوئی تھی۔سب اپنا کام چھوڑ کر ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔رباب نے تیل لگانے کا ارداہ ملتوی کر دیا۔سب سے ملنے کے بعد وہ دادی کے پاس بیٹھ گا ئیں۔

کیا بات ہے قدسیہ بڑی خوش دکھائی دیتی ہو۔عائشہ نے رباب کو چائے کے لیئے اشارہ کیا تھا۔

خوش تو میں واقعی بہت ہوں اور رباب تم زرا ادھر بیٹھ جاؤ۔چائے میں پیوں گی مگر ابھی نہیں بعد میں۔یہ بتاؤ کہ ابو کہاں ہیں؟

بیٹھک میں ہیں خالہ۔

بھاک کر بلا لاؤ۔

سب نے حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

حمنہ بیٹی ادھر آؤ زرا میرے پاس۔حمنہ واشنگ مشین بند کر رہی تھی۔

خالہ میرے کپڑے بہت بھیگ گئے ہیں۔میں ابھی نہا کر آتی ہوں۔

حمنہ کے جواب پر انہوں نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔ابو آ گئے تھے۔خیریت وغیرہ پوچھ کر بیٹھ گئے۔

عائشہ۔۔بھائی جان اماں آج میں آپ لوگوں کے پاس سوالی بن کر آئی ہوں۔

ہمارے پاس ایسا کیا ہے قدسیہ بہن جس کے لیئے آپ سوالی بن کر آئی ہیں۔ابو نے حیرت سے پوچھا تھا۔

میں بیوہ عورت ہوں آپ کے بھائی جان کچھ جائداد چھوڑ کر گئے تھے جس سے بچوں کی اچھی تعلیم ہو گئی۔بچیوں کی شادیاں کر چکی ہوں۔اب دو ہی بیٹے ہیں۔آپ جانتے ہیں میں نے جواد کی شادی کی تھی۔دونوں میاں بیوی پڑھے لکھے تھے۔جاب کرتے تھے۔مزاج نہیں ملا تو علیحدہ ہو گئے۔جواد میرا بہت پیارا بیٹا ہے آپ تو بیسیوں بار اس سے مل چکے ہیں بھائی صاحب۔۔۔

ابو نے اثبات میں سر ہلایا۔

اس کی خوبیاں خامیاں سب سامنے ہیں۔میں چاہتی ہوں اس کی زندگی پھر سے سنور جائے اور مجھے لگتا ہے۔۔۔انہوں نے دادی کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ دیا۔مجھے لگتا ہے حمنہ کے ہمارے گھر آ جانے سے سارا گھر ہی سنور جائے گا۔

وہ سب کے سب متحیر سے انہیں دیکھے گئے۔

حمنہ مجھے دے دیں بھائی جان میں ماں بن کر اسکا خیال رکھوں گی۔

میں کیا کہوں اتنی جلدی۔۔۔۔

ابو نے کچھ کہاں چاہا ہی تھا کہ دادی میدان میں کود پڑیں۔

کیا اتنی جدلی۔قدسیہ سے کیا چھپا ہے۔نہ انکا کچھ ہم سے پوشیدہ ہے۔دیکھے بھالے لوگ۔بس بسم اللہ کرو۔۔

ہاں اماں آپ ہی سفارش کریں یہ سوچ بچار تو غیروں میں ہوتی ہے۔اپنوں میں کیا تکلف۔

امی ان کی بڑائی کی قائل ہوگئیں۔سب کچھ جاننے کے بعد کہ کئی بار ان کے رشتوں کے بارے میں ان کے سامنے روئی تھیں پھر بھی اس سلیقے سے رشتہ مانگ رہی تھیں۔ایک پر سکون سی مسکراہٹ نے ابو کے لبوں کا احاطہ کرلیا۔انہوں نے امی کی طرف دیکھا جن کی آنکھیں جھلملا سی گئی تھیں۔

اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔اماں نے تو بات ہی ختم کردی۔

ان میں سے کوئی بھی نا جانتا تھا کہ یہ دن ان کے لیئے کیا خاص لے کر آرہا ہے۔باتھروم سے باہر آتی حمنہ بھی نہیں۔جسے اپنی انگلی سے انگوٹھی اتار کر پہناتے ہوئے قدسیہ خالہ نے اسکی پیشانی چوم لی تھی۔انہوں نے فون کر کے مٹھائی کی ٹوکری بھی منگوالی تھی۔

لیکن تمھیں اچانک یہ خیال آیا کیسے۔دادی چپکے سے پوچھ رہی تھیں۔وہ ہنس کر ٹال گئیں۔کیا بتائیں جس دن وہ اپنی رشتے دار خاتون کے ساتھ آئی تھیں واپسی پر انہوں نے پوچھا تھا۔

تمھیں حمنہ کیسی لگی؟

عمر زیادہ لگتی ہے۔

اور ثانیہ۔۔۔

ہاں اچھی ہے مگر مجھے نہیں لگتا کہ ہو لوگ زیادہ جہیز دے سکیں گے۔کتنے آرام سے انہوں نے کہا تھا۔قدسیہ حیرت سے انکا منہ دیکھنے لگیں۔

مگر وہ بہت پیاری بچیاں ہیں۔تمہارا گھر جنت بنا دیں گی۔

ارے تو تم کیوں نہیں بنا لیتیں جنت۔۔وہ ہنس کر بولیں۔لڑکیاں تو وقعی بہت پیاری ہیں۔آ کرتم نے بھی تو جواد اور فواد کی شادیاں کرنی ہیں۔وہ لڑکی حمنہ تمہارے جواد کی ہم عمر ہوگی۔

انہوں نے تو بات کی تھی قدسیہ کے لیئے سوچ کا در وا کر گئیں۔اتنا عرصہ صرف جواد کو راضی کرنے میں لگا تھا جو دوسرا تجربہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔مگر قدسیہ نے حمنہ کو بہت اچھی طرح پرکھا تھا۔وہ جانتی تھیں کہ وہ دونوں خوش رہیں گے۔

ہارون کی شادی کی تاریخ بھی حمنہ کے ساتھ ہی رکھ دی گئی۔

بھائی ہم کونسا بھابی کو ساتھ رکھیں گے کو تم گھر خالی ہونے کا انتظار کرو۔وہ تمہارے ساتھ ہی جائیں گی۔بس چند دن اپنے چاؤ پورے کریں گے۔ثانیہ نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

میرا یہ مطلب تو نہ تھا ثانیہ۔ہارون کو دکھ سا ہوا۔

مزاق کر رہی تھی بھائی صاحب کا ہے کو اتنا سنجیدہ ہوتے ہو؟

آئندہ ایسا مزاق مت کرنا۔ ہر ایک اپنی جگہ ہوتی ہے۔ ہارون سنجیدگی سے کہہ کر اٹھ گیا تو سب ثانیہ کو لتاڑنے لگے۔

شادی کی تیاریاں تو ساری ہی مکمل تھیں بس کپڑے زیور رہتا تھا۔ جس کے لیئے کئی کئی بار بازاروں کے چکر لگتے۔ ثانیہ اپنی کولیگز سے نت نئے ڈیزائن لے کر آ جاتی پھر وہ سر جوڑ کر بیٹھ جاتیں۔ حمنہ کو کھینچتیں تو وہ کنی کترا جاتی۔

بھئی مجھے کیا پتہ۔ تم لوگ دیکھ لو۔

سونیا کو بس اپنے کپڑوں کی فکر تھی۔ مہندی، بارات، پھر بھائی کی بارات ولیمہ وہ الگ چکرائی پھر رہی تھی۔ علی شیر مشورہ دیتا۔

چوڑی دار پائجامہ اور کرتا اور ساتھ میں لمبا سا دوپٹہ۔

وہ تصور ہی تصور میں اسے اس لباس میں دیکھتا۔ وہ کلرز پوچھتی تو سنجیدگی سے بتاتا۔

نیلا پائجامہ، سرخ قمیض، سبز دوپٹہ۔

وہ جھنجھلا کت چہرہ دیکھتی۔ ایک دم سنجیدہ۔ سمجھ میں نہ آتا کہ مزاق کیا ہے یا سنجیدگی سے مشورہ دیا ہے۔

ہاں کیا حرج ہے سب سے منفرد لگو گی۔

تم پینڈو کے پینڈو رہو گے۔

وہ خفا ہو کر جانے لگتی۔ علی شیر ہاتھ پکڑ کر روک لیتا۔

پگلی تم کچھ بھی پہنو اچھی ہی لگو گی۔ آخر دیکھا تو میں نے ہی ہے نا۔

آخری جملہ منہ میں بڑبڑاتا۔ سونیا چیخنے لگی۔ آخر میں کیا کہا ہے۔

اسے یقین تھا کہ اسکا مزاق اڑانے کو کچھ کہا ہوگا۔ وہ محظوظ سی مسکراہٹ لبوں کے گوشوں میں سمیٹے چمکتی آنکھوں سے دیکھتا کھڑا ہو جاتا۔ بظاہر بڑی بیزاری سے دادی کو پکارتا۔

نانو اس چڑیل سے بچائیں۔

دادی کے پاس فرصت کیاں تھی وہ اپنے حافظے کو مانجھ مانجھ کر مہمانوں کی فہرست مرتب کرتیں۔ فلاں کو ضرور بلانا ہے۔ اس نے فلاں کی شادی میں کہا تھا۔

ہا۔۔۔ تمہاری تو پانچوں پوتیاں بیٹھی ہیں۔

رات کو اپنی لرزیدہ آواز میں ٹپے سنانے لگتیں۔ وہ بہت خوش تھیں اور اپنی خوشی کا کھل کر اظہار کر رہی تھیں۔

رباب سوچتی ایسا ہی ہنگامہ اس کی شادی میں بھی تو ہوا تھا۔

گھر میں شادی کے ہنگامے تھے ادھر احمر کے فون اسے زچ کر رہے تھے۔ اب تو سب گھر والوں کو بھی خبر ہو گئی تھی مگر سب خاموش تھے۔ وہ چاہتے تھے رباب خود فیصلہ کرے۔

مجھے بات نہیں کرنا احمر صاحب۔ اس کے رویے میں لچک آتی ہی نہ تھی۔

اتنی سختی کا مظاہرہ مت کرو۔ اس نے فون پٹخا تو امی نے ٹوکا، رباب حیرت سے انہیں دیکھنے لگی۔

آپ اس شخص کے لیئے کہہ رہی ہیں جس نے اپنے بچے کی پیدائش پر ایک فون تک کرنا گوارا نہیں کیا۔

نہیں میں تو بس۔۔۔امی خاموش سی ہو گئیں۔ وہ جو کہنا چاہتی تھیں کہہ نہ پا رہی تھیں۔ کہیں رباب یہ نہ سمجھے کہ اس کے بچے انہیں کھٹکنے لگے ہیں۔

حمنہ مایوں بیٹھ گئی تھی۔ دور پرے کے مہمان آنا شروع ہو گئے تھے۔ لیہ سے پھوپھو اور ان کی بیٹیاں آ گئی تھیں۔ سرِ شام ہی ڈھولک لے کر بیٹھ جاتیں۔ ماؤں کی ڈانٹ کے باوجود ان کی قلقل، بہتے جھرنوں جیسی ہنسی رکتی نہ تھی، اسی شور میں فون کی آواز علی شیر نے سنی تھی وہ کچن میں چائے لینے آیا تھا۔

کون بات کر رہا ہے۔ سلام کے بعد دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

میں علی شیر۔ آپ کون؟

میں احمر۔۔رباب سے بات ہو سکتی ہے۔

علی شیر ریسیور کو گھور کر ایک منٹ کہہ کر چلا گیا۔ جہاں رباب مہمانوں کو کھانے کے بعد چائے سرو کر رہی تھی۔

آپی احمر بھائی کا فون ہے۔

اس نے دروازے میں کھڑے ہو کر بتایا اور پلٹ گیا تھا۔ کمرے میں بھنبھناہٹ پھیل گئی تھی۔

احمر کا فون آتا ہے

رباب کی احمر سے صلح ہو گئی؟

وہ لب کاٹتی کمرے سے نکل گئی۔

کیا مسئلہ ہے آپ کے ساتھ احمر میں نے کتنی دفعہ کہا ہے مجھے فون مت کیا کریں۔ وہ چھوٹتے ہی بولی۔

جب تک تم میری بات نہیں سنو گی میں فون کرتا رہوں گا؛۔

کیا چاہتے ہیں؟ وہ اس کی ڈھٹائی پر کلس گئی۔

رباب مجھے صفائی کا موقع تو دو۔ غلطی کا اعتراف تو کرنے دو۔

صفائی۔۔۔غلطی۔۔۔احمر صاحب کیا کہنا ہے آپ نے۔ آپ مجبور ہو گئے تھے یا مجبور کر دیئے گئے تھے۔ اس عورت سے شادی آپ نے برضا و رغبت کی تھی، اس بات اعتراف کر کے کہ آپ کو اس سے محبت ہو گئی ہے۔ وہ پھٹ پڑی۔

تم مجھے معاف نہیں کر سکتیں۔ کسی کمزور لمحے میں کیئے گئے اعتراف نے انہیں مجرم بنا دیا تھا۔

اب کیا دلیل لاتے۔ مزہب اجازت دیتا ہے مگر مزہب عدل کا حکم بھی تو دیتا ہے۔ وہ کہاں عدل کر پائے۔ کتنے برس گزرے انہوں نے پلٹ کر بیبی کو دیکھا تھا نہ بچوں کو۔ وہ وقتی کشش جسے وہ محبت سمجھ بیٹھے تھے۔ ختم ہوئی تو اندازہ ہوا وہ کیا کھو بیٹھے ہیں۔ دو کشتیوں میں سوار ہو چکے تھے۔ نہ دوسری بیوی کو بے وجہ چھوڑ سکتے تھے۔ نہ رباب اور بچوں کو فراموش کرنا آسان تھا۔

معافی۔۔کیسی معافی۔ آپ تو صاحب اختیار ہیں جو چاہیں کر سکتے ہیں۔ رباب کے لہجے میں

طنز امڈ آیا۔

جب چاہیں برسوں پرانے رشتے توڑ سکتے ہیں۔ جب چاہیں بے لوث محبتوں کو قدموں تلے روند کر نئی محبت حاصل کر لیں اور جب چاہیں لوٹ کر آ جائیں اور کہیں مجھ سے غلطی ہو گیء اور میں سب کچھ بھولکر معاف کر دوں کیوں؟ کس لیئے؟ صرف اس لیئے کہ میں عورت ہوں۔ کمزور ہوں مگر میں کیا کروں احمر صاحب کہ اس عورت کو اپنی تزلیل نہیں بھولتی۔ رباب کو اپنی بے وقعتی کا احساس معاف نہیں کرنے دیتا۔ کیا میں اسی قابل ہوں کی جب چاہو سینے سے لگا لو۔ جب چاہو دھتکار دو۔ نہیں کر سکتی تمہیں معاف۔ کبھی نہیں احمر کبھی نہیں:۔ وہ پھواٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔

بچوں کی خاطر۔ وہ خود بھی سسک اٹھے۔

بچوں کی خاطر۔ ہاں بچوں کیا خاطر تم بھی انہی کی خاطر پلٹے ہو۔ جب د دوسری بیوی تمہیں بچہ نہ دے سکی تو میری طرف پلٹ آئے۔ بچوں کے لیئے نا۔ میں کہاں ہوں۔ میں تو کہیں بھی نہیں ہوں۔ میں تو۔۔۔۔ اس نے ریسیور پٹخ دیا اور روتیروتے وہیں بیٹھ گئی۔

کاغز کا رشتہ نہیں دل کے بندھن باندھے تھے تم سے تم نے انہیں بھی توڑ ڈالا۔ اب کوئی کسی کو کیسے زنجیر کرے احمر دل کے بندھن بھی کمزور اور جھوٹے نکلے۔

حمنہ چلی گئی تھی۔ سبرینہ بیاہ کر آ گئی تھی۔ طویل خوشی آمیز ہنگامے کے بعد اب گھر کی فضاء میں سکون گھل مل گیا تھا جس میں سبرینہ کی کھنکتی چوڑیاں اور نقرئی ہنسی عجیب خوبصورت سا سماں

باندھ دیتی۔ رباب کو اپنی شادی کے ابتدائی ایام یاد آتے تو سبرینہ کی آنکھوں کی چمک اور شنگرفی لبوں کی مسکان کی دائمی ہونے کی دعا کرتی۔

شادی کے ہنگامے میں ماہا کا زکر بار بار ہوا تھا کبھی دانستہ کبھی ندانستہ طور پر۔ لوگ کرید کرید کر پوچھتے تھے اور لوگوں کی زبانیں کون پکڑ سکا ہے۔ بس اپنا بھرم قائم رکھنا تھا۔ سو یہی کہتے رہے کہ ہو ملک سے باہر ہے اپنی میاں کے ساتھ دو تین ماہ تک نہیں آ سکے گی۔ لیکن ان میں سے کسی کو خبر نہ تھی کہ ماہا واقعی ان دنوں عفان احمد کے ساتھ لندن میں تھی۔

آپی آپ کو ابو بلا رہے ہیں۔

نیا نے رات کے کھانے کے بعد رباب سے کہا تھا۔ گھر کی بڑی بیٹی ہونے کے ناتے ابو اکثر مشورے کے لیئے اسے علیحدہ سے بلوا لیا کرتے تھے۔

جی ابو عمر اور احد کو علی شیر کے ساتھ مصروف چھوڑ کر وہ چلی آئی۔ ابو اکیلے ہی تھے۔ امی بھی وہں نہیں تھیں۔ ان کے اشارے پر وہ ان کے سامنے بیٹھ گئی۔ وہ کچھ لمحے اسے دیکھتے رہے۔

کیا بات ہے ابو جی۔ رباب کو الجھن سی ہونے لگی تھی۔

بیٹیاں بیاہی جائیں تو کوئی والدین نہیں چاہتے کہوہ ان کے پاس واپس آ جائیں۔ ابو ایک طویل سانس لے کر بیٹھ گئے۔

کوئی عورت نہیں چاہتی ابو جی کہ اس کا گھر اجڑے مگر حالات مجبور کر دیتے ہیں۔ وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہنے لگی۔

تم نے اپنی زندگی کے بارے میں اب کیا سوچا ہے؟ رباب نے چونک کر انکا چہرہ دیکھا۔ پھر سر جھکا کر ہاتھوں کی لکیریں دیکھنے لگی۔

کیا سوچنا ہے ابو جی کاش اس قابل ہوتی کہ اپنا اور اپنے بچوں کا بوجھ اٹھا سکتی۔

احمر کا فون آیا تھا میرے پاس بلکہ کئی بار آیا ہے۔ وہ سر اٹھا کر انہیں دیکھنے لگی۔

وہ تمہیں واپس لے جانا چاہتا ہے

تو آپ نے کیا کہا اس سے؟

میں نے کہا میں اپنی بیٹی سے بات کروں گا فیصلہ تمہیں کرنا ہے رباب

ابو آپ جانتے ہیں نا اس نے میرے ساتھ کیا کیا ہے۔ وہ جزباتی سی ہو گئی۔

جانتے ہیں، اسی لیئے تو فیصلہ کرنا چاہتے ہیں رباب بیٹا میں اب اس معاملے کو لٹکانا نہیں چاہتا وہ کہتا ہے کہ دوسری بیوی کو علیحدہ رکھے گا۔ یہ گھر جس میں تم رہو گی وہ تمہارے اور بچوں کے نام کر دے گا۔ بس وہ ہر حال میں صلح کرنا چاہتا ہے۔ تم اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ اگر اس کے ساتھ جانا چاہتی ہو تو۔ یا نہی نہیں بھیج دیں گے پوری عزت اور آبرو کے ساتھ بھیجیں گے اور اگر ۔۔

ایک لمحے کو رک کر انہوں نے بغور رباب کے چہرے کے اتار چڑھاؤ کو دیکھا اور جملہ پورا کیا۔ اگر تم اس کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تو پھر اس معاملے کو یہیں ختم کر دیں گے ہمیشہ کے لیئے۔ پھر ایک کغزی رشتہ رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تم اس سے خلع لے لینا۔۔

ابو۔۔۔ رباب گنگ سی انہیں دیکھے گئی۔

رباب میں زندگی میں معاملات کو لٹکانے کا قائل نہیں ہوں۔ ہمارے مزہب میں بھی ایسی کوئی پابندی نہیں ہے کی جبرا ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گزاری جائے۔ تم بہت اچھی طرح سوچ لو صبح مجھے بتا دینا۔

وہ بیجان قدموں کے ساتھ کمرے سے نکلی تھی۔ برآمدے میں کھڑے ہو کر اس نے سینے میں اٹکی سانس کو کھینچ کر باہر نکالا۔ اندر کمرے سے باتوں کی اور ہلکی ہلکی قہقہوں کی آواز آ رہی تھی۔

یا اللہ۔ اس نے وحشت سے اردگرد دیکھا۔ وہ کسی کا بھی سامنا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ سامنے تاریک سیڑھیاں چھت کی طرف جا رہی تھیں۔ وہ معمول کی طرح چل کر سیڑھیاں چڑھ گئی۔

نیم تاریک چھت پر سناٹا راج کرتا تھا۔ ادھورا چاند دیور کے عقب سے طلوع ہوتا ہوا ایک طویل القامت درخت کی پھننگ پر اٹک گیا تھا۔ دیوار پر دبے پاؤں چلتی بلی اپنی کانچ سی آنکھوں کے ساتھ اسے گھورنے لگی۔

تنہائی اور خاموشی، وحشت ناک سوچوں کا جنگل اس کے اندر اگنے لگا۔ وہ نیچے دیوار کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

آئی لو یو رباب گرم سانسوں کی حدت اسے اپنے گال پر محسوس ہوئی۔ اس نے بے ساختہ اپنے چہرے کو چھو کر دیکھا۔

مجھے اس سے محبت ہو گئی ہے رباب۔ ایک زہریلی سوچ نے ڈنگ مارا وہ بلبلا اٹھی۔

یار کیا چیز ہوتم ،تمہیں دیکھتا ہوں تو جی چاہتا ہے رب سے ایک اور زندگی مانگ لوں ۔ یہ ایک زندگی تو بہت تھوڑی ہے تمہیں پیار کرنے کے لیئے۔

مضبوط بازوؤں کا سکون بخش لمس اس کت تن پر جا گا تو وہ سر اٹھا کر چاند کو دیکھنے لگی۔

کیا چہاتی ہوتم سارا دن امہترے سامین تمہارے گھٹنے سے لگ کر بیٹھا رہوں۔ کتنی سیلفش ہوتی ہوتم عورتیں بھی۔

ادھورا چاند ٹکڑے ٹکڑے ہوکر بکھرا تھا۔

سوری جانم ۔۔سوری۔ دراصل ایک بہت پرانا دوست مل گیا تھا کھینچ کر لے گیا۔ میں نے لاکھ کہا کہ بھئی ہماری پیاری پیاری بیوی۔

اس نے آنسوؤ ں کی دھند میں کھو جانے والے چاند کو تلاشنے کی کوشش کی ۔

میں اس سے شادی کرر ہا ہوں۔

ایک آگ سی بھڑک اٹھی تھی ۔تم مجھے معاف نہیں کرسکتیں ۔۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے رباب
۔

نہیں ۔۔۔وہ چیخ اٹھی۔ دھوکا ہے۔۔۔فریب ہے۔۔خود غرض۔۔ظالم انسان۔۔مکار۔

دونوں مٹھیاں بھینچ کر وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی ۔۔

تم اس سے خلع لے لو۔

نہیں ۔وہ ایک دم تھم سی گئی تھی ۔ میں اس کے ساتھ نہیں رہ سکتی ، میں ایک بار پھر دھوکا نہیں کھا

سکتی۔

:عورت بن کر نہیں ماں بن کر سوچو۔تمہیں بھلے شوہر کی ضرورت نہ ہو تمہارے بچوں کو باپ کی ہے۔۔ایک نئی سوچ نے ڈرتے ڈرتے سر اٹھایا،

میں اس خود غرض شخص کا چہرہ بھی نہیں دیکھنا چاہتی ۔ میں ابو سے کہہ دوں گی کہ۔

ہم نانا کے ساتھ کیوں رہتے ہیں؟ عمر گویا اس کے سامنے کھڑا پوچھ رہا تھا۔

میں ابو سے کہہ دوں گی کہ۔۔۔

کیا ہمارے پاپا مر گئے ہیں؟

عمر نے اس سے پوچھا تھا۔احد ابھی اس رشتے سے انجان تھا مگر کل کو وہ بھی یہی سوال کرتا۔

کیوں ۔۔،کیوں زندگی ہم سے وہ فیصلے کرواتی ہے جو ہم کرنا نہیں چاہتے ۔۔کیوں ۔رات تیزی سے ڈھل رہی تھی اور وحشت ناک سوچوں کا جنگل تھا کہ گھنا ہی ہوتا جا رہا تھا۔

کتنا عرصہ۔۔۔شاید چار یا۔۔۔ساڑھے چار سال۔

بند دروازے پر ہاتھ رکھتے ہوئے اس نے سوچا اور ہلکا سا دھکا دیا۔ دروازہ کھلتا چلا گیا۔سامنے امرود کے درخت پر چڑیاں چہچہا رہی تھیں ۔ ہلکے ،پیلے سبز ،گدرے گدرے امرود سبز شاخوں کو اور سے جھانک رہے تھے ۔ وہ نیم تاریک ڈیوڑھی میں داخل ہوئی پھر پلٹ کر دروازے سے باہر ڈرائیور کو انتظار کرنے کا کہا جو سیاہ لمبی گاڑی سے ٹیک لگائے سوچ رہا تھا کہ بیگ صاحبہ اس خستہ سے گھر میں آخر کیا لینے آئی ہیں۔

اس نے سوچا تھا صحن پہلے کی طرح ہی آباد ہوگا۔ وہ ایک دم سب کی نظروں کی زد میں آ جائے گی۔ مگر صحن خالی تھا اور اس خالی صحن میں چڑیوں کا شور بہت محسوس ہو رہا تھا۔ دادی کا تخت ان کے وجود کے بغیر عجیب سا لگا۔ سفید تخت پوش پر کتابیں بکھری تھیں۔

محبت مردہ پھولوں کی سمفنی اداس نسلیں کے ٹائٹل سامنے تھے۔

سب لوگ کہاں گئے۔ اس خاموشی سے ماہا کو ایک دم وحشت سی ہونے لگی۔

امی۔۔۔سونیا۔۔۔حمنہ آپی۔ اس نے گھبرا کر پے در پے آوازیں دی تھیں۔

کمرے سے سونیا گھبرا کر نکلی تھی پھر ٹھٹک گئی۔

آپ وہ دور کھڑے ہی پوچھ رہی تھی۔ وہ پہلے سے لمبی خوبصورت اور سنجیدہ ہوگئی تھی۔ ہاں میں ۔اس کا جی چاہا وہ بھاگ کر اس سے لپٹ جائے۔

ہاں میں وہ بدقت مسکرائی۔ سب کہاں ہیں۔

سب سونیا نے ایک لمحے کو سوچا پھر سامنے سے ہٹ گئی۔: آپ اندر تو آئیں۔

ماہا اندر آ گ ء۔

گھر پر کوئی نہیں ہے اس نے پوچھا۔

سب کہیں گئے ہیں آپ بیٹھیں میں کولڈ رنک لاتی ہوں۔ وہ اسے کیسے اجنبی مہمانوں کی طرح ٹریٹ کر رہی تھی۔ ماہا نے اسکا ہاتھ پکڑا۔

نہیں تم میرے پاس بیٹھو۔ میں بس تھوڑی دیر کے لیئے آئی ہوں۔

جی۔ وہ پلنگ پر بیٹھ گئی۔ ماہا نے دیکھا کمرے میں کچھ بھی تو نہ بدلا تھا۔ وہی سیٹنگ۔ بس ایک بیڈ شیٹ نئی تھی یا پھر ایک کلاک کا اضافہ تھا۔

سونیا نے نظر بچا کر اسے دیکھا۔ سیاہ ستاروں کی بارڈر والی ساڑھی میں وائٹ گولڈ کا سیٹ پہنے وہ بے پناہ خوبصورت ہوگئی تھی۔ اس کی شخصیت میں ایک عجیب سا وقار اور تمکنت پیدا ہوگئی تھی ۔وہ اس کی بہن تھی مگر سونیا کو اس سے اجنبیت محسوس ہو رہی تھی،

تم کیا کرتی ہو آج کل؟ ماہا نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

ایم اے کے اگزام دے کر فارغ ہوئی ہوں۔

سونیا نے جواب دیا۔ ماہا خاموش ہوگئی۔

سب لوگ حمنہ آپی کے گھر گئے ہیں۔

حمنہ کے گھر؟

حمنہ آپی کی شادی ہوگئی تھی قدسیہ خالہ کے بیٹے کے ساتھ۔۔۔۔انا کپل اتنا زبردست لگ رہا تھا کہ میں آ پکو کیا بتاؤں۔ میں آپ کو تصویریں دکھاؤں؟

ماہا کو لگا اس کے کہے الفاظ ابھی بھی سونیا کو یاد تھے۔ کیا کچھ نہیں کہا تھا اس نے حمنہ کو۔ سونیا اس کلے جواب کا انتظار کیئے بغیر البم نکال لائی۔

حمنہ آپی کے ہاں دوسرا بیٹا ہوا ہے۔ سب وہیں گئے ہیں۔

ماہا نے البم کھولی۔ ہنستے مسکراتے چہرے اس کے سامنے تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جو اس کے اپنے

تھے۔وہ لوگ تھے جنہیں وہ دھتکار گئی تھی۔

حمنہ آپی کو رخصت کرتے وقت ابو اس کی پیشانی چوم رہے تھے۔وہ ابو اور دادی کے گلے لگی رو رہی تھی۔ہارون بھائی کا مضبوط ہاتھ اس کے سر پر قرآن کی چھایا کیئے ہوئے تھا،

ماہا کی آنکھیں دھندلا گئیں۔

وہ کیسے رخصت ہوئی تھی۔

گالیاں، بددعا، طعنے، کوسنے۔

والدین کی عزت روند کر جانے والیوں کو جہیز میں یہی سب ملا کرتا ہے۔

پھر اس نے ثانیہ کو دلہن بنے دیکھا۔اس کی مسکراہٹ کسی تصویر میں مانند نہ تھی۔وہی لوگ وہی چہرے۔وہی دعائیں۔وہی رسمیں۔

حمنہ آپی کی شادی کو اسل بھی نہ ہوا تھا کہ ثانیہ آپی کی کولیگ اپنے بھائی کا پروپوزل لے آئیں۔ آصف بھائی بینک میں آفیسر ہیں۔بہت شوخ اور شرارتی۔دادی سچ کہتی تھیں۔جیسا انسان خود ہوتا ہے ویسا ہی اس کو ساتھی ملتا ہے۔

ہاں دادی سچ کہتی تھی، جیسی میں خودغرض تھی ویسے ہی۔

اس نے لبوں پر ہاتھ رکھ کر سسکی روکی۔

ثانیہ آپی کی بیٹی ہے علینہ۔۔۔بالکل آصف بھائی جیسی۔۔۔اس نے رک کر گول مٹول صحت مند بچی پر انگلی رکھی۔وہ ثانیہ کی گود میں ہنس رہی تھی اور آصف اس کی طرف جھکا

نجانے کیا کہہ رہا تھا کہ ثانیہ کی کھلکھلاہٹیں قابو میں نہ آ رہی تھیں۔

ماہا آپی آپ کے بچے۔۔۔

مت پوچھو۔۔۔مت پوچھو۔۔اس کے اندر کوئی سر پٹخ پٹخ کر چیخ رہا تھا۔

سونیا نے اسکا دھواں دھواں چہرہ دیکھا اور بات کے ساتھ ہی صفحہ پلٹ دیا۔

رباب اور احمر پہلو بہ پلو کھڑے تھے۔

رباب آپی کو احمر بھائی لے گئے تھے۔اسے کچھ بھی پوچھنے کی ضرورت نہ تھی۔سونیا خود ہی سب کچھ بتاتی جا رہی تھی۔

رباب بھی چلی گئی۔سب چلی گئیں۔عزت، مان۔فخر اور غرور کے ساتھ ماں باپ کی دعاؤں کے سائے تلے۔سب اپنے اپنے گھروں کو رخصت ہوئیں۔ایک وہی تھی خرماں نصیب۔

یہ سبرینہ ہے ہماری بھابی۔

ہاں تمہاری بھابھی۔۔۔میں بدنصیب۔۔۔لیکن نہیں یہ بدنصیبی تو میں نے خود کمائی ہے۔

سونیا۔۔۔تم لوگ۔۔۔تم مجھے بھی یاد کرتے ہو۔البم اچانک بند کر کے اس نے تڑپ کر سوال کیا تھا۔

سونیا چپ سی ہو گئی۔

یاد تو کرتے ہوں گے مگر کوئی بھی آپکا نام نہیں لیتا۔سونیا جھوٹ نہ بول سکی۔

کوئی بھی نہی۔ہاں کسی کو لینا بھی نہیں چاہیئے۔وہ وحشت زدہ سی ہو کر کھڑی ہو گئی پھر ہنسنے لگی۔تم

نے ٹھیک کہا کسی کو میرا نام نہیں لینا چاہیئے۔

ماہا آپی سونیا نے کچھ گھبرا کر پکارا۔اس نے ہنستے ہوئے سونیا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا۔

اس طرح کیوں ہنس رہی ہیں؟

خود پر ہنس رہی ہوں۔۔۔گڑیا۔۔۔تم بھی ہنسو۔۔ہنسونا۔۔۔

سونیا لب بھینچے تحیر سے اسے دیکھتی رہی۔ہنستے ہنستے اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔پتہ نہیں وہ ہنس رہی تھی یو رو رہی تھی پھر اس نے بیدردی سے آنکھوں کو رگڑا۔آنکھوں کا سارا نکھار بکھر گیا۔ننگی ہو کر آنکھیں سب آشکار کرنے لگیں۔دکھ۔پشیمانی،ترس سب کچھ ہی ان آنکھوں سے مترشح تھا۔

آپ خوش نہیں ہیں ماہا آپی۔

ہائے کیسے کلیجے پر ہاتھ ڈالا تھا۔

اس نے تیزی سے چہرہ صاف کیا۔

میں۔۔۔میں بہت خوش ہوں۔اتنی دولت۔۔گاڑیاں،،بنگلہ۔۔۔پیسہ زندگی میں کچھ اور بھی چاہیئے خوش ہونے کے لیئے۔

اس کا دل اندر سے مسلا جا رہا تھا،

مارچ میں میری اور علی شیر کی شادی ہے،کاش آپ اس میں آ سکتیں۔

ارے۔۔۔اچھا۔ماہا نے بیاختیار اسے گلے سے لگا لیا،ہاں میں نہیں آ سکتی مگر مجھے پتہ ہے تم بہت خوش رہو گی۔تم بہت اچھی ہو۔مجھے پتہ ہے تم سب ہی خوش رہو گی۔ماں باپ کا مان رکھنے والیاں خوش ہی رہتی ہیں۔نہ بھی رہیں تب بھی مان تو سلامت رہتا ہے۔وہ گود تو میسر آتی ہے جس میں سر رکھ کر رو سکیں۔ارے کتنی دیر ہوگئی۔میں چلتی ہوں،عفان انتظار کر رہے ہوں گے۔

وہ تیزی سے باہر نکلی۔

کسی کو مت بتانا آئی تھی۔یہ امرود۔۔۔یہ امرود بہت میٹھے ہوا کرتے تھے نا۔اس نے ہاتھ بڑھا کر امرود توڑ لیا۔

میں نے پھر کبھی امرود نہیں کھائے۔دادی کو بھی امرود بہت پسند تھے نا۔

ہاں مگر دادی تو اب نہیں رہیں۔

ماہا کے ہاتھ سے امرود نکل گیا۔اس نے پلٹ کر خالی تخت کو دیکھا۔اس کا جی چاہا وہ روئے بین کرے۔مگر وہ رکی نہیں تیزی سے باہر نکل گئی۔ڈرائیور انتظار کرتے کرتے اونگھ گیا تھا۔وہ خالی الذہنی کے ساتھ اس کا پاس سے نکل گئی۔

ہمیں خبر ہے تمام دکھ ہے
ادسیوں کا لباس دکھ ہے۔
یہ تشنگی جو عزاب بن کر ٹھہر گئی۔
بدن کے بوسیدہ ساحلوں پر

تو اس کا عہد دوام دکھ ہے
یہ شور کرتی ہوا کا سارا خرام دکھ ہے
ہمیں خبر ہے تمام دکھ ہے
یہ تم محبت نباہتے ہو
تو اس محبت کا نام دکھ ہے
یہ وصل موسم جو ایک مسلسل مغالطہ ہے
تو اس رفاقت کا نام دکھ ہے
اور ایسی وحشت نما فضاء میں
خاموش رہنا بھی ایک سزا ہے
مگر کسی سے کلام دکھ ہے۔
ہمیں خبر ہے
تمام دکھ ہے

مگر کہوں بھی تو کس سے۔۔۔ یہ کانٹوں بھرا راستہ میں نے خود چنا ہے۔۔۔ چار سال۔ صرف چار سال لگے اور سب ٹھیک ہو گیا۔ اور مجھے لگا تھا کبھی بھی ٹھیک نہیں ہو گا۔ اتنی بیصبری نکلی میں۔

اس نے وحشت زدہ ہو کر طویل سڑک کو دیکھا۔ پھر تصور میں ہنستے ہوئے چہروں کو۔ جہاں خوشی تھی۔ سکون اور اطمینان تھا۔ اس کا جی چاہا وہ اپنے تن سے قیمتی زیورات کو نوچ ڈالے۔ طویل

سڑک پر بھاگتی جائے۔ یہاں تک تکہ کوئی گاڑی اس کا وجود کچلتی روندتی نکل جائے۔ صرف چار سال۔۔۔ چار سال میں سب ٹھیک ہو گیا تھا۔

اس کا جی چاہا اپنا چہرہ تھپڑوں سے سرخ کر لے۔۔۔

وہ جسے لعل سمجھ کر لپکی تھی وہ تو جلتا ہوا انگارہ تھا۔ وہ تو محبت بن کر آیا تھا، اس کی رفاقت اب مسلسل دکھ کے سوا کیا تھی۔۔۔ مگر کس سے کہے۔۔ کس سے کہے۔

ساڑھی کا پلو اس کے قدموں تلے آ گیا تھا وہ گھٹنوں کے بل گری تھی۔

پیسہ۔۔۔ پیسہ۔۔۔ پیسہ۔۔۔ ایک بچہ تک نہ دے سکا اسے۔ اور اسے ضرورت بھی کیا تھی۔۔ بچے تھے اس کے پاس۔۔۔ وہ تو مکمل تھا۔۔۔ ادھوری تو ماہا تھی۔۔ کیا چاہیئے تھا عفام احمد کو۔۔۔۔ اس کا حسین وجود۔۔۔ خوبصورت چہرہ۔ وہ کہتا تھا۔

ماہا مائی لو۔۔ تمہیں ایسے ہی رہنا ہے خوبصورت اور جوان۔

اور جب جوانی ڈھل گئی تو اس کے پاس کیا ہوگا؟

واپسی کے راستے مسدود غبار میں چھپے اسکا منہ چڑا رہے تھے۔ ڈرائیور نے اسے دیکھ لیا تھا وہ گاڑی لیئے اسی طرف آ رہا تھا اور وہ سڑک کیکنارے بیٹھی زور زور سے رو رہی تھی۔

ختم شد۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ The End